تاج الفحول اکیڈمی کی مطبوعات پر اربابِ علم و دانش کے تبصرے اور تاثرات

# اظہار و اعتراف

ترتیب

محمد تنویر خان قادری



تاج الفحول اکیڈمی کی مطبوعات پر ارباب علم ودانش کے تبصرے اور تأثرات

# اظہار واعتراف

ترتیب

محمد تنویر خان قادری

سلسلۂ مطبوعات 84

کتاب: اعتراف واعتبار
مرتب: محمد تنویر خان قادری
طبع اول: ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۲ء

*Publisher*
**TAJUL FUHOOL ACADEMY**
**(A Unit of Qadri Majeedi Trust)**
Madrsa Alia Qadria, Maulvi Mohalla, Budaun-243601 (U.P.) India
Mob.: +91-9897503199, +91-9358563720
E-Mail: qadrimajeeditrust@gmail.com, Website: www.qadri.in.com

| *Distributor* | *Distributor* |
|---|---|
| **Maktaba Jam-e-Noor** | **New Khwaja Book Depot.** |
| 422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6 | Matia Mahal, |
| Phone : 011-23281418 | Jama Masjid, Delhi-6 |
| | Mob. : 0091-9313086318 |

# انتساب

برصغیر کی قدیم ترین درس گاہ

**مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف**

کے نام

# عرض ناشر

تاج الفحول اکیڈمی خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف کا ایک ذیلی ادارہ ہے، جوتاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری (زیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف) کی سرپرستی اور صاحبزادہ گرامی مولانا اسیدالحق قادری بدایونی (ولی عہد خانقاہ قادریہ، بدایوں) کی نگرانی اور قیادت میں عزم محکم اور عمل پیہم کے ساتھ تحقیق، تصنیف، ترجمہ اور نشر واشاعت کے میدان میں سرگرم سفر ہے، اکیڈمی کے زیر اہتمام اب تک عربی، اردو، ہندی، انگلش، گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں اب تک ۷۵/ سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور نشر واشاعت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

تاج الفحول اکیڈمی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے ہر حلقے اور ہر طبقے کی دلچسپی اور ضرورتوں کے پیش نظر اشاعتی خدمات انجام دی ہیں، خالص علمی اور تحقیقی کتب، ادبی اور شعری نگارشات، عام لوگوں کی تربیت واصلاح کے لیے آسان زبان میں رسائل، اکابر بدایوں کی سیرت وسوانح، باطل افکار ونظریات کے رد وابطال اور مسلک حق کے اثبات میں قدیم وجدید رسائل اور غیر مسلم برادران وطن کے لیے اسلام کے تعارف پر مشتمل سلجھا ہوا دعوتی اور تبلیغی لٹریچر غرض کہ اکیڈمی ان تمام میدانوں میں بیک وقت تحقیقی، تصنیفی اور اشاعتی خدمات انجام دے رہی ہے۔

اکیڈمی کی ان خدمات کو اہل علم ودانش کے ایک بڑے حلقے نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنے تأثرات اور تبصروں کے ذریعے اکیڈمی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں اہل علم ودانش کے انہیں تاثرات اور تبصروں کو جمع کیا گیا ہے، تا کہ آئندہ نسلیں اہل علم ودانش کے تاثرات کی روشنی میں تاج الفحول اکیڈمی کی اشاعتی خدمات کی اہمیت، وقعت اور معیار کا صحیح ادراک کرسکیں۔

رب قدیر ومقتدر سے دعا ہے کہ اکیڈمی کی خدمات قبول فرمائے، ہمیں زیادہ سے زیادہ دینی خدمات کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمارے اشاعتی منصوبوں کی تکمیل میں آسانیاں پیدا فرمائے۔ آمین

محمد عبدالقیوم قادری
جنرل سکریٹری تاج الفحول اکیڈمی
خادم خانقاہ قادریہ بدایوں

# فہرست مشمولات

☆☆☆

# عرضِ مرتب

تاج الفحول اکیڈمی نے گذشتہ چند برسوں کے دوران نشر واشاعت کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ کاروان شوق آج بھی پورے حوصلے اور جذبے کے ساتھ سرگرم سفر ہے۔ اکیڈمی کی مطبوعات ملک کی مختلف اہم لائبریریز اور اہل علم ودانش کی خدمت میں اعزازی طور پر بھیجی جاتی ہیں، اس کے علاوہ مختلف ماہناموں میں تبصرہ وتعارف کے لیے بھی روانہ کی جاتی ہیں، بہت سے اہل علم نے اکیڈمی کی مطبوعات پر اپنے تأثرات ارسال فرمائے اور رسائل وجرائد نے تبصرے شایع کیے۔ زیرنظر کتاب میں انہیں تاثرات اور تبصروں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف اور تاج الفحول اکیڈمی بدایوں کی علمی، تحقیقی اور اشاعتی خدمات پر اہل علم وقلم کے تأثرات اور تبصرے جو مختلف رسالوں اور نجی خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں یکجا ہو کر ریکارڈ پر محفوظ ہو جائیں تاکہ جب خانقاہوں اور خانقاہی شہزادوں کی علمی، تحقیقی اور اشاعتی خدمات کی تاریخ مرتب کی جائے یا کوئی اسکالر اس گوشے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائے تو خانقاہ قادریہ کے بارے میں اس کو سارا مواد یکجا میسر آجائے۔

مطبوعہ تبصروں میں اغلاط کتابت کی تصحیح کے علاوہ کسی قسم کی قطع وبرید نہیں کی گئی ہے، من وعن شایع کیے جارہے ہیں۔ ہر تبصرے کے آغاز میں زیرتبصرہ کتاب کا نام مع مصنف اور تبصرہ نگار کا نام درج کیا گیا ہے اور آخر میں رسالے کا نام، دورانیہ، مقام اشاعت، ماہ اشاعت اور صفحات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ عبارت کے درمیان جہاں رسالے کا صفحہ ختم ہو رہا ہے وہاں ایک مخصوص بریکٹ [........] میں رسالے کا صفحہ نمبر ڈال دیا گیا ہے، تاکہ حوالہ دینے میں آسانی ہو۔

اہل علم کے گراں قدر تأثرات ان خطوط سے لیے گئے ہیں جو ان حضرات نے صاحبزادۂ

گرامی مولانا شیخ اسید الحق قادری مدظلہ کے نام ارسال فرمائے ہیں، یہ خطوط چونکہ نجی تھے اس لیے ان میں بعض باتیں ذاتی نوعیت کی بھی تھیں، لہٰذا ان خطوط کا صرف وہی حصہ شایع کیا جا رہا ہے جو علمی، تحقیقی اور اشاعتی معاملات سے متعلق ہے۔ اصول ترتیب کے مطابق ہر خط کے آخر میں اس کی تاریخ بھی درج کر دی گئی ہے، جس خط میں تاریخ تحریر نہیں تھی اس میں تاریخ وصول درج کر دی ہے۔ یہ تمام خطوط کتب خانہ قادریہ بدایوں شریف میں ایک رکارڈ فائل میں محفوظ ہیں۔ بعض تأثرات مطبوعہ کتب ورسائل سے لیے گئے ہیں، ایسے تاثرات کے آخر میں ماخذ کا مکمل حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔

کتاب کی پروف ریڈنگ میں مولانا عبدالعلیم قادری مجیدی (متعلم مدرسہ قادریہ بدایوں) نے مخلصانہ تعاون کیا ہے مَیں ان کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

محمد تنویر خان قادری

مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف

# احقاق حق

سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی

مولانا فروغ احمد اعظمی

☆

تیرھویں صدی ہجری برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لیے سیاسی ادبار اور مذہبی انتشار وافتراق کی صدی رہی ہے۔ ہندوستان کے مشہور علمی خانوادۂ ولی اللّٰہی کے ایک فرد مولوی اسماعیل دہلوی (ولادت ۱۱۹۳ھ/ وفات ۱۲۴۶ھ) نے ابن تیمیہ (متوفی ۷۶۱ھ) کے کاشتہ اور ابن عبدالوہاب نجدی (متوفی ۱۲۰۶ھ) کے پرداختہ نئے اسلامی فرقے ''وہابیت'' کو جزیرۃ العرب سے برصغیر میں درآمد کیا اور پروان چڑھا کر اسلامیان اہل سنت کو دوحصوں میں بانٹ دیا اور عہد رسالت سے چلے آرہے کئی ایسے صحیح متوارث اور اجماعی عقائد ومسائل میں جمہور امت سے اختلاف کیا جن پر عوام وخواص کا اتفاق وعمل چلا آرہا ہے۔ انہیں عقائد میں انبیا واولیا سے توسل وشفاعت اور نذر واستعانت کے عقیدے بھی ہیں۔ جن کے جواز کے قائل خود اسماعیل دہلوی کے دادا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ اسماعیل کے چچا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ عبدالقادر دہلوی علیہم الرحمۃ بھی تھے۔ بلکہ اسی پر ان سب کا عمل بھی تھا جیسا کہ ان حضرات کی کتابوں سے ظاہر ہے۔

شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنے خاندانی بزرگوں کی روش سے ہٹ کر ایک نئی مذہبی راہ اپنائی، جس پر ان کے چچا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر علیہما الرحمۃ نے انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا اور سمجھانے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن شاہ اسماعیل نے اصلاح قبول نہیں کی۔ لہٰذا مجبور ہو کر سب سے پہلے گھر ہی کے لوگوں نے شاہ اسماعیل دہلوی کے تعاقب اور تحریری رد کی ذمہ داری نبھائی، چنانچہ شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب ''تقویت الایمان'' کے رد میں سب سے پہلے شاہ اسماعیل دہلوی کے چچازاد بھائیوں مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی اور مولانا محمد موسیٰ دہلوی صاحبزادگان شاہ رفیع الدین محدث دہلوی علیہم الرحمۃ نے ''معید الایمان'' وغیرہ کتابیں لکھیں۔

اس کے علاوہ اس وقت کے دیگر علما میں علامہ فضل حق خیر آبادی (متوفی ۵/ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء) شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا منورالدین (ابوالکلام آزاد کے والد کے نانا) نے بھی زبانی اور تحریری رد میں نمایاں حصہ لیا اور وہابیت کا پیچھا کیا اور امت کو نظریاتی بدعت ''وہابیت'' سے بچانے کی سعی فرمائی۔ ''تقویت الایمان'' کے رد میں علامہ فضل حق خیر آبادی کی کتاب ''تحقیق الفتویٰ'' بہت مشہور ہے اور اردو میں بھی دستیاب ہے۔

رد وہابیت میں سرگرم اس وقت کے جید نمایاں علما میں ایک نام سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی (ولادت:۱۲۱۳ھ/ وفات:۱۲۸۹ھ) بن شاہ عین الحق عبدالمجید قادری بدایونی خلیفہ حضرت اچھے میاں مارہروی علیہم الرحمۃ کا بھی ہے جنہوں نے ''**المعتقد المنتقد**''، ''بوارق محمدیہ''، ''سیف الجبار'' اور ''احقاق الحق وابطال الباطل'' جیسی کئی اہم کتابیں لکھ کر تقویت الایمان کی ایمان سوز اور جارحانہ وگستاخانہ عبارتوں پر محض حفاظت دین کے تقاضے سے عالمانہ تنقید کی اور مسلمانوں کو اس نئے اعتقادی فتنے سے آگاہ کیا۔

یاد رہے کہ شاہ اسماعیل دہلوی کے وہابی عقائد اور تقویت الایمان کا رد کرنے والے یہ مذکورہ سارے علما اور ان کی تردیدی کوششیں اس وقت کی ہیں جب کہ ابھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری (ولادت ۱۲۷۲ھ/ وفات ۱۳۴۰ھ) پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، یا ان کا ابھی بچپنا تھا۔

مسئلہ توسل واستعانت پر زیر نظر کتاب ''احقاق حق'' رد وہابیت کی انہیں ابتدائی کوششوں میں سے ایک سنجیدہ علمی، تحقیقی واستدلالی کوشش ہے، جو غیبی اشارے پر وجود میں آئی، جس کا پورا نام ''احقاق الحق وابطال الباطل'' [ص:۳۹] ہے۔ یہ اصلاً فارسی زبان میں تھی، جو ''**البوارق المحمدية**'' کے حاشیے پر شائع ہوئی۔

نبیرۂ مصنف مولانا اسید الحق عاصم قادری ازہری زید مجدہ کے اندازے کے مطابق یہ ۱۲۶۵ھ کے آس پاس کی تالیف ہے۔ موصوف ''احقاق حق'' کے ابتدائیہ میں فرماتے ہیں:

> ''ہمارے سامنے جو نسخہ ہے وہ مصنف کی کتاب ''البوارق المحمدیہ'' کے حاشیے پر شائع ہوا ہے، مگر اس میں سن طباعت کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ دو باتیں قابل توجہ ہیں: الف- یہ اشاعت فاضل مصنف کی وفات ۱۲۸۹ھ

کے بعد کی ہے۔ب- یہ کتاب کی پہلی اشاعت نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے
بھی کتاب طبع ہو چکی تھی، اس نسخے کے خاتمۃ الطبع سے یہی اشارہ ملتا
ہے''۔(احقاق حق:ص:۵)

اس کتاب کی تالیف کا سبب مولوی حیدر علی ٹونکی رامپوری (متوفی ۱۲۷۳ھ) ہیں، جو شاہ اسماعیل دہلوی کی نئی فکر سے صرف متأثر ہی نہیں بلکہ متعصب قسم کے داعی اور حمایتی بھی ہیں، یہ شاہ اسماعیل کے ساتھی اوران کے پیر سید احمد رائے بریلوی کے مرید ہیں اوران کے دفاع اور حمایت میں کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔علمی خیانت،فکری عصبیت، غیر سنجیدہ اور غیر علمی اسلوب اور سوقیانہ انداز بیان ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

قصہ یہ ہوا کہ علامہ شاہ فضل رسول قادری علیہ الرحمۃ کے ایک بریلوی عزیز ندائیہ سلام ''**السلام علیک ایھا النبی الکریم، ایھا الرسول الرحیم**'' کا ورد پڑھا کرتے تھے جو وہابی عقیدے میں شرک ہے۔

مصنف علیہ الرحمۃ کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''وہ فرقہ (وہابیہ) جو ابھی کچھ عرصے سے نمودار ہوا ہے اور امت مرحومہ کی تکفیر، اولیا کے نفوس قدسیہ کی تفسیق اور حضرات انبیائے کرام صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کی توہین، اس کا شعار وعلامت ہے۔اسی فرقے کے ایک فرد (حیدر علی ٹونکی) کو جب اس ورد کی اطلاع ملی تو اس نے منع کیا اور پڑھنے والے کے کافر ومشرک ہوجانے کا فتویٰ دے دیا۔لہٰذا اس نے مجھ سے اس ورد کے جواز وعدم جواز کے بارے میں دریافت کیا، یہ خاکسار اس سلسلے میں جو کچھ جانتا تھا وہ اس کو بتادیا کہ اس ورد کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، چہ جائے کہ اس کے کفر وشرک ہونے کی''۔(ایضاً ص:۳۰)

حیدر علی کو یہ زبانی جواب معلوم ہوا تو اس نے مصنف پر شرک کا الزام لگا کر اور توبہ کا مطالبہ کر کے اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان پڑھنے کی تلقین کی،مصنف نے اسے مختصر تحریری جواب لکھا کہ

''یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للّٰہ'' خاص ترکیب کے ساتھ پڑھنے کی اجازت

شاہ عبدالعزیز قدس سرہ سے ان کی مہر کے ساتھ موجود ہے، اس کا مطالعہ فرما لیجیے کیوں کہ آپ کے اوپر یہ حجت کافی ہے اور کتاب تقویت الایمان کے مطالعے کی مجھ کو کوئی ضرورت نہیں، معاف کیجیے''۔(ایضاً ص:۳۱)

اس خط کے جواب میں حیدر علی نے غیظ وغضب سے بھرا ہوا خط لکھا، مصنف نے ارتجالاً اس کا مختصر جواب تحریر کیا اور لکھا کہ:

''شاہ عبدالعزیز صاحب کی تقلید، مولوی اسماعیل دہلوی پر ایمان لانے سے زیادہ دشوار نہیں اور پھر استعانت بغیر اللہ علی الاطلاق شرک وحرام نہیں ہے۔ تفسیر عزیزی میں شاہ عبدالعزیز صاحب ارشاد فرماتے ہیں: کہ یہاں جاننا چاہیے کہ غیر سے استعانت اس طور پر کہ اس میں غیر پر اعتماد ہو اور اس کو عون الٰہی کا مظہر نہیں سمجھتا، تو یہ حرام ہے اور اگر توجہ صرف باری تعالیٰ کی طرف ہے اور غیر کو صرف عون الٰہی کا مظہر سمجھتا ہو اور حق تعالیٰ کے کارخانۂ اسباب وحکمت کو اس میں دیکھتا ہو اور غیر اللہ سے صرف ظاہری استعانت کرتا ہو، تو یہ جائز و روا ہے۔ اور انبیا و اولیا نے اس قسم کی استعانت بغیر اللہ کی ہے یہ قسم استعانت بغیر اللہ نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ بھی استعانت باللہ ہی ہے''۔(ایضاً ص:۳۱ تا ۳۴ ملخصاً)

مصنف آگے لکھتے ہیں:

''ہر چند اس خط کے بعد اس شخص (حیدر علی ٹونکی) نے جواب الجواب نہیں لکھا، لیکن اکثر احباب کا اصرار ہوا کہ مَیں اس مسئلے پر تفصیل سے لکھوں۔

(ایضاً ص:۳۴)

چنانچہ مصنف علیہ الرحمۃ اس اصرار کے بعد حضرت اقدس سلطان العارفین شیخ شاہی روشن ضمیر سہروردی بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت بڑے سرکار) کے مزارِ اقدس پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے تو آپ نے دیکھا کہ حضرت [ص:۴۰] بڑے سرکار کا مزار مبارک شیشے کی طرح ہے اور صاحب مزار اپنی قبر میں قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے ہیں، حضرت بڑے سرکار نے حضرت

اقدس مصنف کی طرف توجہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ تمام مصروفیات کو چھوڑ کر جلدی اس رسالے کی تالیف کر، جس کی تالیف کے لیے تم سے کہا جا رہا ہے۔ چنانچہ بڑے سرکار رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی تعمیل میں آپ نے یہ رسالہ تصنیف فرمایا''۔(حاشیہ کتاب:ص:۳۵)

مصنف علیہ الرحمۃ نے اس رسالے کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) حق کو ظاہر کرنے کے بیان میں (ازص:۳۶ تا ۱۰۱)، (۲) باطل کے رد و ابطال کے بیان میں (ازص ۱۰۲ تا ۱۴۶)

ہم نے شروع میں بتا دیا ہے کہ اصلاً یہ کتاب فارسی زبان میں تھی، مصنف علیہ الرحمہ کے پوتے (شاہ عبدالقدیر بدایونی بن شاہ عبدالقادر بدایونی) کے پوتے ازہری فاضل مولانا اسید الحق عاصم قادری بن شاہ عبدالحمید سالم میاں قادری سجادہ نشین خانقاہ قادریہ بدایوں نے فارسی سے اردو میں کامیاب، سلیس و دل پذیر ترجمہ کیا ہے، لیکن یہ ترجمہ لفظی نہیں بلکہ بامحاورہ ہے اوراس میں بھی تلخیص واختصار سے کام لیا گیا ہے۔ نیز کتاب کے مندرجات ومضامین کی تسہیل کر دی گئی ہے۔ تاکہ قاری کا ذہن ترجمے کا بوجھ محسوس نہ کرے اوراس کے ذہن تک متن کی ترسیل آسان ہو جائے اور مصنف کا یہی مقصود بھی ہوتا ہے۔ اس طرح اگر اسے ترجمے کے بجائے اردو ترجمانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

فاضل مترجم نے مزید یہ بھی کیا ہے کہ اصل مراجع سے قرآنی وحدیثی نصوص نیز دیگر نصوص کی تخریج وتحقیق بھی کر دی ہے، اور بیش قیمت تائیدی حواشی بھی تحریر کر دیے ہیں جو اس کم عمری میں حدیثی علوم سے ان کی گہری دلچسپی اور رسوخ کے غماز ہیں، موصوف کی تحقیق وتخریج سے ان کے علم تازہ پر کسی عمر دراز اور تجربہ کار محدث اور محقق و ناقد کا گمان ہوتا ہے۔ **اللّٰھم زد فزد.**

موصوف نے کتاب کی تحقیق وتخریج کے سلسلے میں اپنے ''ابتدائیہ'' میں چند قابل لحاظ باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

**الف**: احادیث کی تخریج کے ذیل میں حتی الامکان ان کے حکم اور درجے کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔

**ب**: بہت سے مقامات پر مصنف نے احادیث یا علما کی عبارتوں کا تلخیصی ترجمہ درج کیا تھا، ان کی اصل عربی غالباً طوالت کے خوف سے قلم انداز فرما دی تھی، ہم نے اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے وہ اصل عربی یا فارسی عبارتیں متن میں درج کر دی ہیں۔(ایضاً ص:۷)

مترجم موصوف کی اتنی ساری محنت کے بعد اصل کتاب کا رنگ وروپ بالکل بدل گیا ہے اور یہ کتاب اس اضافی کام سے تدوین وتحقیق کے نئے مطلوبہ معیار پر پوری اتر رہی ہے اور اس کی معنوی خوبیوں میں چار چاند لگ گئے ہیں اور کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت میں گراں قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

''ابتدائیہ'' کے بعد علامہ عبدالحکیم شرف قادری مدظلہ العالی پاکستان کے قلم سے (از ص ۹ تا ص ۲۹) مصنف کا طویل معلوماتی تعارف بھی شامل کتاب ہے۔ پھر (از ص ۳۰ تا ص ۳۵) مصنف کا مقدمہ ہے، جس میں وجہ تالیف کا تفصیلی بیان ہے۔ اصل کتاب ص ۳۶ سے شروع ہو کر ص ۱۴۶ ر پر ختم ہو جاتی ہے، اخیر میں مراجع ومصادر کا اشاریہ ہے، اس کے بعد کتاب اور حواشی کے مندرجات کی فہرست ہے۔

فصل اول کے کچھ خاص مندرجات یہ ہیں: ☆ تشہد میں حضور ﷺ سے خطاب، صلوٰۃ وسلام کے بعض خصوصی اوقات ومقامات، ☆ دعا میں حضور ﷺ کا وسیلہ، ☆ مدد کے لیے اللہ کے بندوں کو پکارنا، ☆ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئا للہ، ☆ مردے سنتے ہیں، ☆ قبر انور سے اذان کی آواز، ☆ روح کی تحقیق۔

فصل دوم میں دعا اور پکارنے کا فرق بتایا ہے، پھر تقویت الایمان کی سات عبارتیں نقل کر کے ساتھ ہی اس کا باحوالہ سنجیدہ علمی جواب دیا ہے، کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیاں باقی رہ گئیں ہیں، مجموعی طور سے کتاب قابل دید اور لائق مطالعہ ہے اور مصنف علیہ الرحمہ کی علمی عظمت کے ساتھ مترجم موصوف کی کاوشیں بھی لائق تحسین ہیں۔[ص:۴۱]

(ماہنامہ پیام حرم، جمدا شاہی، شمارہ جون ۲۰۰۷ء۔ از ص ۳۹ ر تا ص ۴۱)

☆☆☆

# احقاق حق

سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی

مفتی آل مصطفیٰ مصباحی

☆

خانقاہ بدایوں کے مؤسس و بانی کے نور نظر حضرت سیف اللہ المسلول خاتم المحققین، عمدۃ المدققین ممدوح امام احمد رضا علامہ فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہ العزیز (ولادت ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء/ وفات ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء) ہماری جماعت کے ان قدآور علما و مشائخ میں سے ہیں جو معیار سنیت اور نشان منزل مقصود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عوام کے عقیدۂ و عمل کا تحفظ و اصلاح سیف اللہ المسلول کی تحریر، تقریر، تبلیغ اور تحریک کا ہمیشہ کلیدی حصہ رہا۔ آپ کے حلقۂ تلمذ اور سلسلۂ ارادت سے وابستہ ملک و بیرون ملک کے بے شمار افراد و اشخاص تھے۔ آپ کے اہم کارناموں میں مذاہب باطلہ اور عقائد فاسدہ کا رد و ابطال ہے، آپ نے ایک درجن سے زائد کتابیں تحریر فرمائیں، جن میں **المعتقد المنتقد، بوارق محمدیہ** اور سیف الجبار جیسی علم کلام اور اسلامی عقائد و افکار پر مشتمل تحقیقی کتابیں بھی ہیں، جو ان کے علم کی گہرائی اور وسعت نظر کا پتہ دیتی ہیں۔ آپ نے اپنی تحریر کے ذریعے نومولود فرقۂ وہابیہ اسماعیلیہ کا بڑے شد و مد سے رد فرما کر وہابیائی فکر کو نہ صرف پھلنے پھولنے سے روکا بلکہ تحفظ ناموس رسالت کے لیے مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے شانہ بشانہ شہید لیلیٰ نجد کے عقائد و افکار کی بیخ کنی کے اسباب بھی مہیا فرما دیئے۔

اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر اسی علامۂ جلیل کی کتاب ''احقاق حق'' ہے جس کا پورا نام ''احقاق الحق وابطال الباطل'' ہے۔ اصل کتاب فارسی زبان میں ہے جس کا سلیس اور رواں ترجمہ نبیرۂ سیف اللہ المسلول مولانا اسید الحق عاصم القادری ازہری نے کیا ہے اور اس کتاب پر کتاب کے شایان شان تحشیے کا کام بھی کر دیا ہے۔ مسرت کی بات ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد کتاب کا ترجمہ جدید تحقیق و تحشیہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، ترجمے کے ساتھ اصل کتاب بھی کم از

کم ایک بار شائع ہوتی تو اہل علم کے پاس مصنف کی اصل عبارت بھی محفوظ ہو جاتی۔

خدا بھلا کرے محبّ گرامی مولانا اسید الحق زید مجدہ کا جو خانقاہی ہونے کے باوجود اپنے کو موجودہ خانقاہی رواج سے الگ رکھنے میں غالبًا دین وسنیت کی زیادہ خدمت سمجھتے ہیں، حتی کہ دوسروں کی خامہ تلاشی کر کے اس کی اشاعت سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس سے قبل بھی انہوں نے اپنے دور طالب علمی میں مجدد اعظم امام احمد رضا قدس سرہ کے لکھے ہوئے دو قصیدے ''قصیدتان رائعتان'' کے مسودے کی ایک کاپی المجمع الاسلامی مبارک پور کو دی تھی، جس کو المجمع نے شائع کیا۔ اب مولانا نے جامع ازہر مصر سے فراغت کے بعد نئے انداز اور اسلوب کے ساتھ ''احقاق حق'' کا خوبصورت ترجمہ شایع کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مصنف علیہ الرحمۃ نے غیر اللہ سے توسل واستعانت اور طلب معونت کے جواز واستحسان پر سیر حاصل گفتگو فرماتے ہوئے شرعی وعقلی دلائل کی ایسی ٹھوس مہر لگا دی ہے جس سے ہندوستان کے امام الوہابیہ اسماعیل دہلوی کی کتاب ''تقویت الایمان'' اور اس جیسی دوسری کتابوں کی فریب کاریاں واضح ہو جاتی ہیں اور حق (جواز توسل) کا طلعت زیبا نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

معید الایمان، منتہی المقال، تفویت الایمان، تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ اور امتناع النظیر وغیرہ کی طرح سلسلۂ ردو ابطال میں زیر تبصرہ کتاب ''احقاق الحق وابطال الباطل'' بھی ہے۔ فتنۂ نجدیت کو پھیلانے والوں میں ایک نام مولوی حیدر علی ٹونکی (متوفی ۱۲۷۳ھ) کا بھی آتا ہے۔ یہ سید احمد رائے بریلوی کے مرید اور شاہ اسماعیل دہلوی کے پیر بھائی تھے۔ اس لیے دہلوی کے نظریات کی حمایت اور اس پر ہونے والے حملے کا دفاع ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ویسے ابن تیمیہ اور ابن عبدالوہاب کے ریزہ خوار وہابیوں میں اسلامی معتقدات ونظریات کے الٹے بہاؤ پر بہنے والے اور فضولی اور لایعنی تاویلات کے سہارے اسے برحق قرار دینے کی پرانی ریت رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ تو ان فریب کاروں کے فریب کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لیکن سادہ لوح افراد کو اس زہریلے فریب سے بچانا لازم ہے۔ اسی جذبۂ واخلاص سے مصنف علیہ الرحمہ نے یہ کتاب تالیف فرمائی۔ بلفظ دیگر دراصل ٹونکی کی بکواس اس کتاب کی تالیف کا سبب بن گئی۔ مقدمے میں مصنف علیہ الرحمۃ نے خود بیان فرمایا ہے:

''میرے عزیزوں[ص:۵۸] میں ایک شخص بریلی میں رہتا تھا اور یہ ورد پڑھتا تھاالسلام علیك ایھا النبی الکریم السلام علیك الرسول الرحیم ۔(ترجمہ:اے نبی کریم آپ پرسلام ہو،اے رسول رحیم آپ پر سلام ہو)وہ فرقہ جو ابھی کچھ عرصے سے نمودار ہوا ہے اور امت مرحومہ کی تکفیر، اولیا کے نفوس قدسیہ کی تفسیق اور حضرات انبیائے کرام صلوۃ اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کی توہین اس کا شعار وعلامت ہے،اسی فرقے کے ایک فرد (ٹونکی) کو جب اس ورد کی اطلاع ملی تو اس نے بے محابا اس ورد کو پڑھنے سے منع کیا اور پڑھنے والے کے کافر ومشرک ہوجانے کا فتویٰ دے دیا۔ وہ ورد پڑھنے والا اس خاکسار بے مقدار سے تعلق رکھتا تھا،لہٰذا اس نے مجھ سے اس ورد کے جواز وعدم جواز کے بارے میں دریافت کیا۔

(احقاق حق:ص:۳۰)

پھر سلسلۂ مراسلت شروع ہوا۔ دو تین بار کے تبادلۂ مکاتیب کے بعد ٹونکی صاحب خاموشی کے ساتھ روپوش ہو گئے اور جواب سے عاجز رہے، پھر حضرت سیف اللہ المسلول نے اس موضوع کو ایسے ناقابل تردید ٹھوس دلائل سے مستحکم وثابت فرمایا کہ مخالفین کو مجال دم زدن نہیں پھر اسے رسالے کی شکل دی۔

اس رسالے میں دو فصلیں رکھی گئی ہیں۔ پہلی فصل اظہار حق میں اور دوسری فصل رد وابطال میں۔ پہلی فصل کے ذیل میں ٹونکی صاحب کے ان ہفوات کا شدید رد کیا گیا ہے کہ حضورﷺ کو ندا وخطاب سے یاد کرنا کفر وشرک ہے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے حدیث تشہد کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضورﷺ کو ندا وخطاب احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اس تعلق سے متعدد حدیثیں اور شارحین کی توضیحات وتشریحات ذکر کرنے کے بعد مصنف قدس سرہ بطور فائدہ ارشاد فرماتے ہیں:

''یہاں یہ بات ثابت ہوئی کہ آنحضرتﷺ نے صحابہ کو بصیغۂ خطاب ہی سلام تعلیم فرمایا، اور اسی طرح صحابہ نے اپنے بعد والوں کو، وہاں سے

مجتہدین تک اور مجتہدین سے عام مسلمانوں تک اور آج ہم تک اسی طرح یہ تشہد آیا ہے، یہ مقام حیرت و استعجاب ہے کہ ایسی صورت میں ندا کی حرمت یا شرک ہونے کا قول ایک ایسے شخص کی زبان پر کیسے آ سکتا ہے جو بظاہر شریعت محمدیہ کا صراحتاً انکار بھی نہیں کرتا۔(مترجماً، ص:۴۲،۴۳)

اس کے حاشیے پر مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری ازہری نے ذہن وفکر کو اپیل کرتی ہوئی بات تحریر فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''تشہد کے الفاظ اگرچہ مختلف واقع ہوئے ہیں (جیسا کہ مصنف نے تشہد ابن مسعود، تشہد ابن عباس اور تشہد ابن عمر کا ذکر کیا) مگر تمام روایتوں میں حضور ﷺ پر سلام بصیغۂ خطاب و ندا ہی وارد ہوا ہے۔ حضور کی ظاہری حیات مبارکہ اور بعد وصال صحابہ کا عمل اسی طرح رہا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، سیدہ عائشہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابن عمر اور حضرت ابوسعید خدری رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے صحیح روایات موجود ہیں، امام مالک مؤطا میں فرماتے ہیں: (ترجمہ) ''حضرت عروہ بن زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب کو سنا کہ وہ منبر پر لوگوں کو تشہد سکھا رہے ہیں، آپ فرما رہے تھے کہ اے لوگو! پھر اس طرح کہو **التحیات للّٰہ الزاکیات للّٰہ الطیبات للّٰہ الصلوات للّٰہ السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ الخ** اس روایت میں واضح ہے کہ حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں لوگوں کو جو تشہد تعلیم فرمایا اس میں السلام علی النبی (نبی پر سلام) نہیں ہے بلکہ السلام علیک ایھا النبی (اے نبی آپ پر سلام ہو) ہے۔ حضرت ابن مسعود کی متذکرہ روایت کے علاوہ کسی صحابی سے کوئی روایت نہیں ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضور ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد صحابہ نے تشہد کے الفاظ میں تبدیلی کر لی ہو۔ حضرت ابن

مسعود کی اس روایت کے سلسلے میں ملاعلی قاری کا کلام متن میں مذکور ہے اور ہم نے گذشتہ حاشیے میں امام ابوالمحاسن کا نقد بھی نقل کیا ہے''۔(حاشیہ ص:۴۱،۴۲)

دعا میں حضورﷺ کو خطاب کے ساتھ وسیلہ بنانے والی حدیث کو بھی مصنف علیہ الرحمہ نے اپنے مدعا کے اثبات میں پیش کیا ہے۔خصوصیت سے حضرت عثمان بن حنیف والی حدیث جسے ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ ایک نابینا صحابی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے، ان کو حضور اقدسﷺ نے یہ دعا تعلیم فرمائی:''**اللّٰھم انی اسئلک و اتوجّہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ یا محمد انی توجھت بک الی ربّی فی حاجتی ھٰذہ لتقضی لی اللّٰھم فشفعہ فیّ**'' یہ حدیث توسل واستعانت وطلب معونت میں اپنے منطوق و مدلول اور مصداق ہر لحاظ سے صریح ہے۔اس حدیث [ص:۵۹] پاک کی تفہیم میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ جمہور سلف صالحین کے نزدیک یہ دعا آپﷺ کی حیات ظاہری کے ساتھ خاص نہیں۔یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے اپنی حاجتوں کے متعلق انہیں الفاظ میں دعا حضور اقدس ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد بھی مانگی ہے اور عہد صحابہ سے لے کر آج تک امت مسلمہ کا اس حدیث پر اس کے متعین کلمات کے ساتھ عمل جاری ہے۔فاضل محقق محشی نے اس حدیث کے رجال پر گفتگو کر کے اس پر پڑنے والے اعتراض کا جواب دیا ہے اور حدیث کا باقوت ہونا ثابت کیا ہے، خصوصاً طبرانی کی تصحیح نقل کر کے حدیث کے بے غبار ہونے کو واضح کیا ہے۔اس کے علاوہ ٹونکی صاحب کی ہرزہ سرائیوں کے جواب میں حضرت سیف اللہ المسلول نے جن اہم گوشوں پر عمدہ روشنی ڈالی ہے ان کا اجمالی خاکہ کچھ اس طرح ہے:

(۱) حضور اقدسﷺ ہر امتی کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔
(۲) حضور اقدسﷺ قبر میں اپنی امت کے احوال سے واقف ہیں۔
(۳) حضور اقدسﷺ کے نام پاک کی برکت۔
(۴) حضرت زید بن خارجہ کا حیرت انگیز واقعہ کہ مرنے کے بعد دوبارہ چند لمحوں کے لیے زندہ ہوئے تو رسالت محمدی وخاتمیت محمدیﷺ کی گواہی دی کہ انہوں نے یا رسول اللہ

السلام علیك ورحمة الله وبرکاته پڑھا۔
(۵) صحابۂ کرام کے بعض ان اشعار کا ذکر جن میں حضور اقدس ﷺ سے استعانت کے لیے ندا وخطاب کے الفاظ ہیں۔
(۶) علما و مجتہدین کے بعض ان اشعار کا ذکر جن میں حضور اقدس ﷺ کے ساتھ استعانت اور استشفاع (طلب شفاعت) بھی ہے۔
(۷) یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کے ورد کی شرعی حیثیت پر گفتگو اور اس کے جواز پر مستند علما کے اقوال کا ذکر۔
(۸) سماع موتی پر تحقیقی گفتگو۔
(۹) روح کی تحقیق۔

ان تمام موضوعات پر گفتگو کر کے فاضل مصنف علیہ الرحمہ نے کلیدی مسئلہ ''مسئلہ توسل و استعانت'' کو ایسا واضح فرما دیا ہے کہ عقل سلیم رکھتے ہوئے کسی بھی شخص کے لیے توسل سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

پوری کتاب تحقیقی دلائل سے پُر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر بعد میں حلقۂ دیوبند سے تعلق رکھنے والے مفسد حضرات نے دہلوی وہابی افکار وعقائد کو حرز جاں بنا کر اس کی اشاعت نہ کی ہوتی تو مسئلہ توسل واستعانت جیسے امت کے متفقہ مسائل کی جانب کوئی نجدی شرک و بدعت کی میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا اور آج بھی علم واستدلال کے اعتبار سے منکرین توسل کے فہم واستدلال کی کوئی حیثیت نہیں۔ کتاب اس لائق ہے کہ ارباب فکر و دانش، اصحاب علم وقلم اور عوام اسے بغور پڑھیں اور نظر انصاف سے دہلوی (وہابی) معتقدات ونظریات کے خلافِ اسلام ہونے کا بھر پور نظارہ کریں۔ کتاب تردیدی وتنقیدی ہونے اور ٹونکی صاحب کے مغلظات بکنے کے باوجود اس میں شیریں کلامی اور اعلیٰ معیار کی شائستگی پائی جاتی ہے۔ مصنف قدس سرہٗ نے اپنے مخصوص طرز نگارش میں جو علمی وتحقیقی نقش آرائیاں کی ہیں ان کی افادیت ومعنویت غیر معمولی ہے۔ یہ تحریر طول کلام کے عیب سے پاک ہے۔ یہ تحریر صاف غیر پیچیدہ اور مدلل ہونے کے باعث جدید نسل کے مکدر ذہن کی صفائی میں بڑی معاون ہوگی۔

یقین ہے کہ اس اشاعتی دور میں کتاب کا یہ ترجمہ بار بار چھپے گا، اس لیے چند کتابتی اغلاط اور تصحیح کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کر دینا مناسب ہے تا کہ اگلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جانب توجہ ہو سکے۔

(۱) ترجمے میں ص ۱۰۳/سطر ۴ پر لفظ عوام کو مؤنث لکھا گیا ہے عبارت یہ ہے ''اس کارستانی سے عوام اکثر دھوکا کھا جاتی ہے'' یہاں ''عوام اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں'' ہونا چاہیے کیوں کہ لفظ عوام بالاتفاق مذکر ہے۔

(۲) ص ۱۲۴/سطر ۱۶/ میں اسی طرح ص ۱۲۵/سطر ۵/اور ۹/ میں جہنم کو مؤنث لکھا گیا ہے جب کہ لفظ جہنم مذکر ہے۔

(۳) ص ۱۴۲/سطر ۱۱/لفظ ''کو'' زائد چھپ گیا ہے۔

(۴) ص ۸۹/ کے حاشیے میں سطر ۱۶/ پر ''میت اپنے زیارت کرنے والے کو پہچانتی ہے'' چھپ گیا ہے جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ''میت اپنی زیارت کرنے والے کو پہچانتی ہے''۔

(۵) ص ۹۳/سطر ۵ میں لفظ ''بن'' کے بعد لفظ عباس چھوٹ گیا ہے۔

اس طرح اِکا دُکا فروگذاشتیں راہ پا گئی ہیں۔

مجموعی اعتبار سے کتاب کی طباعت عمدہ ہے، تصحیح کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے، امید ہے کہ یہ کتاب ہر پڑھے لکھے انصاف پسند حلقے میں پہلے کی طرح آج بھی مقبول ہوگی اور ترجمے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔[ص:۶۰]

(ماہنامہ جام نور شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۵۸/تا ۶۰/)

☆☆☆

# احقاق حق

## سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی

مولانا خواجہ عبد الباری

☆

یہ کتاب تیرھویں صدی کے مشہور ہندوستانی عالم اور صاحب تصنیف بزرگ حضرت مولانا فضل رسول قادری بدایونی (م ۱۲۸۹ھ) کی تالیف کردہ ''احقاق الحق وابطال الباطل'' ہے۔ اس میں توسل واستعانت سے متعلق مسائل کی کافی ووافی تحقیق کی گئی ہے۔ کتاب جیسا کہ ابتدائیہ میں تحریر ہے ۱۲۶۵ھ کے آس پاس کی تالیف ہے۔ اصل فارسی میں ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد ہے۔ توسل اور استعانت کے مسائل میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا اس میں شافی جواب دیا گیا ہے۔ کتاب حضرت مصنف کی تحقیق وتدقیق اور ان کے علمی تبحر کا شاہکار ہے۔ استعانت کے مسئلے میں ہم کتاب کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس سے حضرت مصنف کی تحقیق کا اندازہ ہوگا۔

''حضرت ربیعہ بن کعب سے روایت ہے کہ: **قال کنت أبیت مع رسول اللّٰہ ﷺ فاتیتہ بوضوءہ حاجتہ. فقال: سل لی. فقلت: أسالک مرافقتک فی الجنۃ– قال: او غیر ذلک؟ قلت: ھو ذاک. قال: فاعنّی علی نفسک بکثرۃ السجود. (مسلم)**

ترجمہ: حضرت ربیعہ بن کعب سے روایت ہے کہ انہوں ل نے کہا مَیں رسول اللہ ﷺ کے پاس رات گزارتا تھا۔ کسی ضرورت سے حضور کے لیے پانی کا برتن لایا تو مجھ سے فرمایا: مانگو، مَیں نے عرض کی جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ حضور نے فرمایا: اس کے سوا؟ مَیں نے عرض کیا بس وہی۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اپنے نفس پر کثرت سجود سے میری اعانت کرو۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں [ص: ٦٩]:

واز اطلاق سوال کہ فرمود سل بخواہ و تخصیص نہ کرد بہ مطلوبے خاص معلوم شود کہ کار ہمہ بدست و ہمت اوستﷺ ہر چہ خواہد ہر کہ را خواہد باذن پروردگار خود می دہد۔ بیت:

فان من جودک الدنیا وضرتها
ومن علومک علم اللوح والقلم
اگر خیریتِ دنیا وعقبیٰ آرزو داری
بدرگاہش بیا و ہر چہ می خواہی تمنا کن

(شرح مشکوٰۃ ۳۵۳/۱)

ترجمہ: یعنی نبی اکرمﷺ نے مطلقاً فرمایا: مانگو، کسی چیز کی تخصیص نہیں فرمائی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دست مبارک میں تمام امور کا اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو چاہیں جس کو چاہیں عطا فرمائیں۔ (ترجمہ شعر) آپ کی سخاوت سے دنیا وآخرت ہے اور آپ کے علوم سے لوح وقلم کا علم ہے۔ اگر دنیا وآخرت کی بھلائی چاہتے ہو تو ان کی بارگاہ میں حاضر ہو اور جو چاہو مانگو۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

سل أی اطلب منی حاجة. وقال ابن حجر: اتحفک بها فی مقابلة خدمتک لی لأن هذا هو شأن الكرام ولاأكرم منه ﷺ. ويوخذ من إطلاقه عليه السلام الأمر بالسؤال إن الله تعالى مكنه من إعطاء كل ماأراد من خزائن الحق. ومن ثم عد ائمتنا من خصائصه عليه السلام أنه يخص من يشاء ماشاء كجعله شهادة خزيمة بن ثابت بشهادتين رواه البخاری وكتر خيصه فی النياحة لأم عطية فی آل فلان رواه مسلم. (مرقاة ۲/۵٦۷)

ترجمہ: ملاعلی قاری لکھتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ''سل'' مجھ سے اپنی کوئی ضرورت طلب کرو۔ ابن حجر نے کہا کہ میں تمہیں تمہاری خدمت کے بدلے میں تحفہ دیتا ہوں۔ کیوں کہ یہی آپ کی شان کریمی ہے۔ اور آپ سے زیادہ کوئی کریم نہیں ہے اور حضور علیہ السلام کے مطلق سوال کا حکم دینے سے یہ مطلب اخذ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خزانۂ حق سے ہر چیز عطا کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اسی لیے ہمارے ائمہ کرام نے یہ بات آپ کے خصائص میں سے شمار کی ہے کہ آپ جس کے ساتھ جو چاہیں خاص فرمادیں، جیسے حضرت خزیمہ بن ثابت کی گواہی دو گواہوں کے برابر قرار دینا، اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے اور جیسے حضرت ام عطیہ کو فلاں کے گھر والوں پر نوحہ کرنے کی رخصت دینا، اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

اس مسئلے میں تحقیق یہ ہے کہ اگر استعانت اس طور پر ہو کہ مستعان کو خالق عون جانے تو یہ خلاف شرع ہے۔ چاہے یہ امور دنیا میں خواہ امور آخرت میں ہو، خواہ زندوں سے ہو، خواہ مردوں سے ہو، خواہ دور سے ہو، خواہ قریب سے ہو، ایسی استعانت کہ مستعان کو خالق عون مانا جائے یہ صرف باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور قرآن و حدیث میں جہاں کہیں بھی بصیغہ حصر وارد [ص:۷۰] ہوا ہے اس سے یہی مراد ہے۔ دوسری قسم کی استعانت، استعانت ظاہر یہ ہے یعنی مدد مانگنے والا مستعان کو عون الٰہی کا مظہر سمجھتا ہو تو یہ امر ممنوع نہیں ہے اور اس کی تحقیق شاہ عبدالعزیز صاحب کے حوالے سے پیچھے گزر چکی ہے''۔ (احقاق حق، ص:۱۳۸، ۱۴۱)

اس طویل عبارت سے مصنف کی تحقیق کا واضح اندازہ ہو جاتا ہے۔ کتاب کا انتساب حضرت مولانا شاہ عبدالحمید محمد سالم قادری مدظلہ العالی زیب سجادہ آستانہ عالیہ قادریہ بدایوں کے نام ہے۔ ان کے جواں سال اور صاحب علم صاحبزادے مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری (فاضل جامعہ ازہر مصر) نے اس کتاب کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا ہے اور حاشیے پر تخریج اور تحقیق کی خدمت انجام دی ہے۔ مولانا محمد عاصم کی تخریجات اور تحقیقات بھی قابل قدر ہیں

خصوصاً حدیث توسل یعنی حدیث ضریر اور حدیث أطیط عرش کی بہت اچھی تخریج اور تحقیق کی ہے۔آخر میں مراجع ومصادر کے تحت تفسیر، حدیث، رجال اور تاریخ کی ۸۲؍کتابوں کی فہرست ان کے مصنفین کے ناموں کے ساتھ دی ہے۔اس میں کتاب **تبیین کذب المفتری** کے مصنف کی حیثیت سے علامہ زاہد کوثری کا نام درج ہے۔حالانکہ یہ کتاب **تبیین کذب المفتری فیما نسب إلی أبی الحسن الأشعری** بہت معروف کتاب ہے،ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) کی تالیف ہے۔علامہ زاہد کوثری (م ۱۳۷۱ھ) نے اس کی طباعت کے وقت اس پر صرف مقدمہ تحریر کیا ہے۔

(سہ ماہی المجیب پھلواری شریف پٹنہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء ص ۶۹؍تا۷۱؍)

☆☆☆

# احقاق حق

سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول بدایونی

عبدالہادی خاں کاوش، رامپور

☆

حضرت سیدنا شاہ فضل رسول بدایونی قدس سرہٗ شریعت وطریقت کے کامل بزرگ تھے، آپ کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ مخلوقِ خدا کی بھلائی اوران کے روحانی وجسمانی امراض کے علاج ومعالجے میں گزرا ہے، اور آپ نے زندگی بھر مسلک اہل سنت والجماعت کے تحفظ وترویج واشاعت کی قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ آپ کے دور میں عبدالوہاب نجدی کی ''کتاب التوحید'' سے کچھ مسلمان بری طرح متاثر ہوئے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وحضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک سے منحرف ہوکر فتنۂ نجدیت کی نشر واشاعت میں مصروف ہو گئے۔ اس فتنے کے سدّ باب کے لیے دیگر علما کی طرح حضرت سیف اللہ المسلول سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہٗ نے فتنۂ نجدیت کو دبانے اور احقاقِ حق کی بے پناہ کوشش کی اور بے شمار سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان کا تحفظ کیا اور ہزاروں لوگوں کو سیدھی راہ دکھائی، حضرت شاہ فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہٗ نے کتاب ''احقاق حق'' میں مسئلہ توسل واستعانت کی تحقیق پر نہایت فاضلانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب ''احقاق حق'' کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں حق کیا ہے؟ یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے اور دوسری فصل میں باطل کے بطلان کو ثابت اور ظاہر کیا گیا ہے۔ جناب سرور کائنات ﷺ کو حرف ندا کے ساتھ مخاطب کرنا اور یا رسول اللہ کہنے کے بارے میں آپ تحریر فرماتے ہیں درمختار (فقہ حنفی کی مشہور کتاب) میں لکھا ہے:

**ویقصد بالفاظ التشهد معانیها مراوة لهٗ علی وجه الانشاء کأنة یحمداللّٰه تعالی ویسلم علی نبیه وعلی نفسه واولیائه لاالاخبار عن ذلک ذکرهٗ فی المجتبی.**

ترجمہ:تشہد کے معانی قصد وارادے کے طور پر مراد ہیں گویا کہ نماز پڑھنے والا اللہ کی حمد بیان کرر ہاہے اوراپنے نبی ﷺ پرسلام بھیج رہا ہے (**السلام علیک ایھا النبی** کہہ کر) اورخود پراوراولیا پرسلام بھیج رہاہے اور یہ تشہد کی حکایت نہیں ہے۔

یعنی واقعۂ معراج کی حکایت نہیں ہے بلکہ اس سے خود بالارادہ جناب سرورکائنات ﷺ کے حضور سلام پیش کرنا ہے۔حضرت فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہٗ مدد کے لیے اللہ کے بندوں کو پکارنے کے بارے میں تحریرفرماتے ہیں:

حدیث پاک میں آیا ہے **اذا انفلتت دابة احدکم فلیناد اعینونی یا عباداللّٰه.** ترجمہ: جب تم میں سے کسی کا چوپایہ بدک کر بھاگ جائےتو وہ اس طرح پکارے، اے اللہ کے بندوں میری مدد کرو، خدا تم پر رحم فرمائے۔

گویا خدا کے مخصوص بندوں سے مدد مانگی جاسکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ اپنے مزارشریف میں امت کے تمام حالات سے آگاہ اور باخبر ہیں، اس بارے میں سیدنا سیف اللہ المسلول حضرت فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہٗ تحریرفرماتے ہیں:

مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ اس معاملے میں حضور ﷺ کی حیات وموت میں کوئی فرق نہیں ہے۔اپنی امت کے مشاہدے اور ان کے احوال کی معرفت وغیرہ یہ بھی حضور ﷺ پر ظاہر ہے۔کچھ بھی مخفی نہیں، اگراس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ تو خاص اللہ کی صفت ہے بندوں کو کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جوبھی عالم برزخ کی طرف مومنین میں سے انتقال کرتا ہے وہ زندوں کے احوال سے واقف ہوتا ہے۔ ابن مبارک نے سعید بن مسیّب سے روایت کی ہے: **لیس یوم الا یعرض علی النبی ﷺ اعمال امته غدوة و عشیة فیعرف بسیماھم و اعمالھم فلذلک یشھد لھم** یعنی ہر دن صبح وشام نبی اکرم ﷺ پر

آپ کی امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں،تو آپ ﷺ ان کے اعمال
اور نشانیوں سے انہیں پہچان لیتے ہیں اور اسی سبب (میدان حشر میں)
حضورﷺ اپنی امت پر گواہی دیں گے۔

کتاب احقاق حق میں فاضل مصنف نے[ص:۵۰] مولوی اسماعیل دہلوی کی تصنیف کتاب تقویت الایمان کی مختلف عبارتوں کی مدلل طریقہ پر تردید کی ہے اور تائید میں اکابر علما وصلحا کے اقوال نقل کیے ہیں۔

ہم محترم اسید الحق محمد عاصم قادری کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے فاضل مصنف کی فارسی تصنیف''احقاق حق'' کا نہایت آسان وسلیس اُردو زبان میں ترجمہ کر کے امتِ مسلمہ کو مسلک اہل سنت والجماعت کے تحفظ وترویج واشاعت کے فریضے کو اسی طرح انجام دیا ہے جیسا کہ سیدنا سیف اللہ المسلول فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہٗ چاہتے تھے کہ مسلک اہل سنت والجماعت کا تحفظ کیا جائے ہمیں امید ہے کہ مدرسۂ قادریہ کا جو نیا علمی وادبی دور مولانا عاصم قادری کی جدو جہد سے شروع ہوا ہے، وہ بدایوں کے قادری خاندان کی نشاۃ ثانیہ تک ضرور پہنچے گا۔

(ماہنامہ ضیاء وجیہ، رامپور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۵۰/۵۱)

☆☆☆

# خیرآبادیات

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی

☆

تحقیق وتنقید کے نام پر اس وقت بیشتر جو کام ہمارے سامنے آ رہے ہیں ان کی حیثیت کٹ پیسٹ سے زیادہ کی نہیں ہے۔ یہ ظاہرہ خصوصیت کے ساتھ اس وقت عصری دانش گاہوں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسکالرایڈونچر کے مصنف نے لکھا ہے:

Knowledges are killed in the universities by these degrees.

اس کے باوجود کچھ ایسے علم دوست اور ارباب تحقیق وتنقید آج بھی موجود ہیں جو اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے اور تحقیق وتنقید کے اصولوں کی پاسداری میں ایمان رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک علم دوست اور بحث ونظر کے اصول ومبادی کی پاسداری کرنے والے کی جگر کاوی کا ثمرہ ''خیرآبادیات'' کی شکل میں اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کا تعلق حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی اور خیرآبادی سلسلۂ علم وفضل کے احوال وآثار سے ہے۔ یہ کتاب علامہ فضل حق خیرآبادی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال مکمل ہونے پر ملک بھر میں ان کی یاد منائے جانے والے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور علامہ کی بارگاہ میں پیش کیا جانے والا تحریری خراج عقیدت بھی۔ یہ کتاب خانقاہ قادریہ بدایوں کے چشم وچراغ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی کی تحقیق وتنقید کا خوبصورت نمونہ ہے۔

خیرآبادی درس گاہ اور خیرآبادی شجرۂ فضل وکمال کے احوال وآثار پر مشتمل کتاب ''خیرآبادیات'' ۲۶۱ صفحات کو محیط ہے، جس میں مختلف عناوین اور ذیلی عناوین کے تحت گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں ''خیرآبادیات'' کے بعض Experts کے تأثرات ہیں۔ اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے ''خیرالبلاد خیرآباد'' کے عنوان سے اس قصبے کی تاریخ پر اور خانوادۂ خیرآباد کے عنوان سے خانوادے کی ہندوستان میں آمد اور ان کی تاریخی جڑوں پر گفتگو

کی گئی ہے اور پھر خانوادۂ خیرآباد کے چند مشاہیر کا اجمالاً تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ''خانوادۂ خیرآباد کی اہل علم خواتین'' کے سرنامے سے اس خانوادے کے علم وفضل کے لحاظ سے تین ممتاز خواتین اوران کے علمی کارناموں سے متعلق بکھری ہوئی معلومات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''مدرسۂ خیرآباد'' کے عنوان سے درس گاہ خیرآباد کے تاریخی پس منظر، نصاب تعلیم اور اس مدرسۂ خیرآباد کے عناصر اربعہ: مولانا عبدالحق خیرآبادی، تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا ہدایت اللہ خان رامپوری اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''خیرآبادی طریقۂ درس اور اس کی خصوصیات''، ''خیرآبادی اساتذہ کی شفقت اور خیرآبادی تلامذہ کی عقیدت'' کے مختلف عناوین کے تحت نہایت دل نشیں گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد ''استاذ بھائی کا رشتہ'' کے عنوان سے یہ دکھایا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ صرف اساتذہ اپنے تلامذہ سے اور تلامذہ اپنے اساتذہ سے محبت والفت کا رشتہ رکھتے تھے بلکہ واقعات کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نسبت تلمذ کی بنا پر استاذ بھائی کے رشتوں کا بھی احترام رکھا جاتا تھا اور ایک استاذ کے شاگرد آپس میں وہ رشتہ اخوت رکھا کرتے تھے جو کسی بھی طرح حقیقی بھائیوں سے کم نہیں ہوا کرتا تھا۔ موجودہ دور میں اس طرح کے واقعات اساطیر اور قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔

اس کے بعد بدایوں کے ان ارباب علم وفضل کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھوں نے خیرآبادی درس گاہ سے خوشہ چینی کی اور پھر خود اپنی مسند تدریس آراستہ کر کے اس درس گاہ کے فیضان کو عام کیا۔ اس کے بعد ''کتب خانہ قادریہ میں خیرآبادی نوادر'' کے عنوان سے مدرسہ عالیہ قادریہ کے کتب خانے میں موجود خیرآبادی علما کی تصانیف کے نایاب قلمی نسخے اور قدیم مطبوعات اور علامہ فضل حق، فضل رسول اور آزردہ کے مکاتیب کے ایک مجموعے کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یقینی طور پر یہ تعارف محققین کے لیے گنج گراں مایہ ہے جو پہلی بار سامنے آرہا ہے۔ اس کے بعد ''فضل حق، فضل رسول اور آزردہ'' کے عنوان سے ان تینوں عبقری شخصیات کی خصوصیات، ان کے باہمی روابط اور ان کے رشتۂ [ص:۶۲] الفت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور پھر نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کے اس قول کا مختلف جہتوں سے جائزہ لیا گیا ہے کہ مفتی صدرالدین آزردہ استاذ بھائی کا رشتہ ہونے کے باوجود علامہ فضل حق خیرآبادی سے اس لیے ناراض رہتے تھے کہ انہوں نے شاہ اسماعیل دہلوی کا

رد کیا تھا۔ اس کے بعد ''علامہ فضل حق خیرآبادی اور حافظ محمد علی خیرآبادی'' کے عنوان سے شیخ الاسلام سید حافظ محمد علی خیرآبادی قدس سرہ جو مخدوم سید نظام الدین اللہ دیا (م ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء) کی اولاد سے ہیں ان کا ذکر خیر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے ان سے تصوف کی مشہور زمانہ کتاب 'فصوص الحکم' پڑھی تھی اور ان سے روحانی فیض بھی پایا تھا، لہٰذا بجا طور پر آپ کا شمار علامہ کے اساتذہ میں ہونا چاہیے۔

شاہ اسماعیل دہلوی نے تقویت الایمان لکھی اور اس میں قابل اعتراض باتیں تحریر کیں تو علامہ نے اولین صدائے احتجاج بلند کی۔ ''علامہ فضل حق خیرآبادی اور شاہ اسماعیل دہلوی'' کے عنوان سے اسی موضوع کو چھیڑا گیا ہے اور اس پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ درمیان میں ان لوگوں پر طنز ملیح کیا گیا ہے جنہوں نے اس اہم مسئلے کو لفظی گورکھ دھندہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد تقویت الایمان کے رد میں علامہ کی اولین تحریر ''تقریر اعتراضات بر تقویت الایمان'' جو فارسی میں ہے اور جس کا تعلق مسئلۂ امتناع النظیر سے ہے جسے ترجمہ کر کے مولانا عبدالحکیم شرف قادری (پاکستان) نے مترجمہ تحقیق الفتویٰ کے آخر میں اصل فارسی متن کے ساتھ شائع کیا ہے اسے بھی یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ مصنف کے بقول ''ہندوستان میں یہ اب تک شائع نہیں ہوئی ہے''۔ اس کے بعد جامع مسجد دہلی میں ہونے والے تاریخی مناظرے کا ذکر کیا گیا ہے اور رسالہ 'یک روزی' جو علامہ کی تقریر اعتراضات کے رد میں ہے اس سے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں اور تحقیق الفتویٰ سے شاہ اسماعیل دہلوی کے دلائل کا جواب بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ضمناً مفتی صدر الدین آزردہ کی اس تحریر کا ذکر کیا گیا ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں انہوں نے امکانِ نظیر کے مسئلے میں علامہ سے اختلاف کیا ہے۔ اس تحریر کے تعلق سے مصنف کتاب نے تحقیقی انداز میں اس کے سنہ تصنیف کے متعلق مختلف معروضات قائم کر کے داخلی اور خارجی شواہد سے بحث کو ایک نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ''شاہ صاحب کا موقف دلائل کتاب و سنت سے مزین تھا اور علامہ کا موقف محض لفظی گورکھ دھندہ'' اس قول کی بھی قلعی کھولی گئی ہے۔ یہ پوری بحث بڑی دلچسپ ہے اور مصنف کے تحقیقی مزاج و منہاج کا پتہ دیتی ہے۔ اس کے بعد ''علامہ فضل حق خیرآبادی کے بارے میں بعض بے بنیاد روایتیں'' کے عنوان سے علامہ کے تعلق سے بعض بے سرو

یا روایات مثلاً یہ کہ علامہ آخری وقت میں شاہ اسماعیل دہلوی کے تعلق سے اپنی تردیدی تحریروں پر نادم تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ سب ''بدایوں والوں'' کے بہکاوے میں کیا تھا۔ اس طرح کی روایات کو تحقیق و تنقید کے میزان پر رکھ کر پرکھا گیا ہے۔ یہ بحث بھی اس کتاب کی خاص اور خصوصیت کے ساتھ لائق مطالعہ مباحث میں سے ہے۔ اس کے بعد ''علامہ فضل حق خیرآبادی اور سید حیدر علی ٹونکی'' کے عنوان سے 'تحقیق الفتویٰ' کے منظر عام پر آنے کے ۲۰ رسال بعد اس کے جواب میں آنے والے رسالے اور اس کے مصنف کے متعلق گفتگو کی گئی ہے اور پھر خود علامہ کی جانب سے اس کے رد میں لکھے جانے والے رسالے اور علامہ کے شاگردوں کی جانب سے لکھے جانے والے تردیدی رسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس علمی معرکے کے تعلق سے نواب صدیق حسن خاں کے ریمارک پر مصنف کی جانب سے دلچسپ ریمارک لگایا گیا ہے۔ (دیکھیے ص:۱۷۱)

مفتی سعد اللہ مرادآبادی علامہ کے ہم عصر اور تیرھویں صدی کے اکابر علما میں تھے۔ جب علامہ لکھنؤ پہنچے اور آپ کے علم و فضل کا شہرہ ہوا تو ان دونوں فضلا کے مابین معاصرانہ اختلاف شروع ہوا، زبانی اور تحریری مباحثے ہوئے، انہیں مباحثوں اور علمی نوک جھونک کی روداد ''علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی'' کے عنوان سے ذکر کی گئی ہے۔ اس کے بعد ''علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی معرکے'' کے عنوان سے علامہ کے نقد و نظر کی تقسیم کر کے آپ کے کچھ دلچسپ نقد و نظر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ علامہ فضل حق، علامہ فضل رسول اور مفتی آزردہ کے باہمی علمی معرکے کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے اور علامہ کی ذہانت اور حاضر جوابی سے متعلق ایک معاصر محقق کے شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا عبدالحق خیرآبادی اور ان کے تلامذہ کے علمی معرکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ حصہ بھی دلچسپ ہے اس سے تیرھویں صدی میں ہونے والے علمی معرکوں اور علمی اختلاف کے باوجود فریقین کے باہمی [ص:۶۳] کشادہ قلبی اور جذبۂ احترام کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد علامہ اور علامہ کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحق خیرآبادی کے سلسلے میں مشہور کچھ لطائف اور بذلہ سنجیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''خیرآبادیات پر تحقیقی، تصنیفی اور اشاعتی کام'' کے عنوان سے ان اہل قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے خیرآبادیات پر کام کیا ہے۔ یہ حصہ بھی خیرآبادیات

کے ریسرچ اسکالرز اور تحقیق وتنقید سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بیش قیمت ہے۔اس کے بعد دو ضمیمے ہیں: پہلے ضمیمے میں سید حیدر علی ٹونکی کے رسالہ 'صیانۃ الاناس ' سے ان کے غیر شائستہ، غیر علمی اسلوب کے کچھ نمونے ذکر کیے گئے ہیں۔مصنف کے بقول ''تا کہ یہ بات روشنی میں آ سکے کہ فریقین میں سے کس نے علمی دلائل کا سہارا لیا تھا اور کس کے پاس محض جدل ومکابرے کا لفظی گورکھ دھندہ تھا'' اس میں خود مؤلف نزہۃ الخواطر کی علمی ثقاہت کا مقدمہ قارئین کی عدالت میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے ضمیمے میں علامہ فضل رسول بدایونی تصنیف 'سیف الجبار' سے جامع مسجد کے مناظرے کی روداد نقل کی گئی ہے۔آخر میں حواشی ہیں، اسی میں مصنف محترم نے اصل عربی، فارسی عبارتیں ذکر کی ہیں چونکہ اصل کتاب میں صرف ترجمے پر اکتفا کیا ہے تا کہ قاری کا تسلسل متأثر نہ ہو۔سب سے آخر میں مراجع ومصادر ذکر کیے گئے ہیں۔ یہ مراجع ومصادر کی فہرست خود محققین کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔عربی مراجع ومصادر کی تعداد ۱۴/ ہے جب کہ فارسی مصادر کی تعداد ۶/ اور اردو مصادر کی تعداد ۱۵/ ہے۔مقالات ومضامین جن سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تعداد پانچ ہے، جب کہ قلمی نسخے جن سے براہِ راست مدد لی گئی ہے ان کی تعداد سترہ ہے۔اس طرح مصادر ومراجع کی یہ طویل فہرست مؤلف محترم کی جگر کاوی اور شب بیداری کی غماز ہے۔

اس پوری کتاب کو ہم مختلف ریسرچ پیپرز کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں جن کا تعلق خیرآباد، خیرآبادیات اور اسی کے مختلف گوشوں سے ہے، کتاب از اول تا آخر انتہائی متین علمی، تحقیقی اور تنقیدی اسلوب اور شگفتہ نثر میں لکھی گئی ہے۔ دوران مطالعہ قاری کو کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف کسی فریق کی طرف داری کر رہے ہیں یا زبردستی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔مؤلف محترم نے اپنے ''اظہاریہ'' میں لکھا ہے کہ:

> مَیں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ خیرآبادیات کے سلسلے میں اب تک دستیاب شدہ معلومات میں کچھ اضافہ کرسکوں۔

یہی درحقیقت ریسرچ کا مقصد بھی ہے۔یقینی طور پر مؤلف محترم اپنی کوشش میں صد فی صد کامیاب ہیں اور انہوں نے اپنی اس تحقیق سے مباحث و واقعات کا اضافہ کیا ہے یا مشہور و معروف مباحث کو نئے انداز سے پیش کیا ہے اور مختلف شکوک وشبہات کے ازالے کی کوشش کی

ہے۔ کتاب کا ''اظہاریہ'' کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے لیے بصیرت افروز ہے۔ اس کتاب میں اگر کوئی عبث ہوسکتا ہے تو صرف یہ ہے اردو زبان میں ہونے کے باوجود ''غلطی پروف'' ہے، اس سے بعض معمولی قسم کی غلطیوں کا استثنا ہے۔ مثلاً ص: ۹۵ر پر آخری پیرا میں لکھا ہے ''مولانا فضل حق خیرآبادی کے افادات کا طرف رجوع کرے''، یہاں ''کا'' کی بجائے ''کی'' ہونا چاہیے تھا، ص: ۲۱۸ر پر آخری پیرا میں ''حاذق المک'' لکھا ہے جو دراصل ''حاذق الملک'' ہے، ص: ۲۳۹ر پر تلخیص الحق کے اقتباس میں دسویں سطر میں ''قد لکتہ الحساب'' لکھا ہے جو دراصل ''فذلکتہ الحساب'' ہونا چاہیے۔ رسالۂ تر دید حیدر علی ٹونکی سے مؤلف محترم نے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں علامہ فضل رسول بدایونی نے مولوی حیدر علی رامپوری کو ''فاضل کامل رأس المحققین، لوذعی، المعی مولوی حیدر علی رامپوری زادافاداتہ (دیکھیے ص: ۱۶۴) سے یاد کیا ہے، یہ اقتباس مجھے ذرا کھٹکتا ہوا معلوم ہوا، کیوں کہ جہاں اختلاف علمی نوعیت کا نہ ہو بلکہ معاملہ کفر و اسلام اور دین و ایمان کا ہو وہاں فریق مخالف کو کم از کم اتنے القاب و آداب کے ساتھ یاد نہیں کیا جا سکتا اور اگر علامہ فضل رسول بدایونی نے انہی القابات سے ان کو واقعی یاد کیا ہے تو اسے ان کی بہت ہی وسعت قلبی پر محمول کیا جائے گا۔

کتاب کا سرورق بہت عمدہ ہے، کاغذ بھی عمدہ اور نئے ڈھنگ کا لگایا گیا ہے اور ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ کتاب کا انتساب درس گاہ خیرآباد کے عناصر اربعہ مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا ہدایت اللہ رام پوری اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کی علمی عظمتوں کے نام کیا گیا ہے۔ جا بجا رجال و اعلام وغیرہ سے متعلق مختلف صفحات پر دیے گئے حواشی نے کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھا دی ہے۔ میں نے اس کتاب کے مطالعے سے پورا لطف اٹھایا ہے، بہت ساری معلومات اکٹھا کی ہیں اور بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ میرے خیال سے اردو کے ہر قاری کے لیے عموماً اور خیرآبادیات سے اور تیرھویں صدی کی علمی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصاً اس کتاب کا مطالعہ بہت پر لطف اور دماغ روشن کرنے والا ثابت ہوگا۔[ص:۶۲]

(ماہنامہ جام نور دہلی، نومبر ۲۰۱۱ء، ص۶۲ر تا ۶۴ر)

☆☆☆

# خیرآبادیات

## مولانا اسید الحق قادری بدایونی

محمد عارف اقبال

☆

علامہ فضل حق خیرآبادی (پ ۱۷۹۷ء/ و ۱۸۶۱ء) کے والدِ محترم علامہ فضل امام خیرآبادی (وفات ۱۸۲۴ء) دہلی کے صدر الصدور تھے۔ انہوں نے دہلی میں ایک مخصوص مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس کے فارغین میں علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ بھی تھے۔ علامہ فضل حق نے علم حدیث کی تحصیل شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی درسگاہ میں کی۔ تیرہ برس کی عمر میں درسیات سے فراغت حاصل کی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ چند برس انگریزی حکومت کی ملازمت میں بھی رہے، اس کے بعد مختلف اوقات میں ریاست جھجھر، الور، سہارنپور، رامپور، لکھنؤ اور ٹونک وغیرہ میں ملازمت کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف نمایاں کردار ادا کرنے کی پاداش میں ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا پھر سزا کے طور پر انڈمان کی جیل میں بھیج دیے گئے، جہاں ظلم وصعوبت کے ایک سال دس ماہ اور تیرہ دن گزار کر ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انہوں نے تادم حیات علم وتحقیق کے دامن کو تھامے رکھا۔ قید کے دوران میں بھی اپنی متحرک علمی زندگی کا ثبوت دیا۔ ان کی تصانیف کے ذخیرے میں منطق، طبیعات، امور عامہ، الٰہیات اور علم الکلام وعقائد جیسے موضوعات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ وہ عربی زبان وادب کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کے عربی اشعار کی تعداد چار ہزار سے متجاوز بتائی جاتی ہے۔

زیرنظر کتاب ''خیرآبادیات'' خیرآبادی سلسلۂ علم وفضل کے احوال وآثار پر مشتمل ہے۔ اس کے مصنف مولانا اسید الحق قادری (پ: ۶ رمئی ۱۹۷۵ء) خانوادۂ بدایوں شریف کے چشم وچراغ ہیں۔ انہوں نے حفظ قرآن کے بعد درس نظامی میں فضیلت کی اور جامعہ ازہر (مصر) سے تفسیر وعلوم قرآن کی تعلیم کے بعد وہیں سے افتا میں تخصص کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے جامعہ ملیہ

اسلامی دہلی سے علوم اسلامیہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ تدریس، تحقیق، تصنیف اور تبلیغ ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اب تک دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور بیس سے زائد کتابیں ترتیب، ترجمہ و تخریج وغیرہ کے ذیل میں شایع ہوئیں۔

خیرآباد کے تاریخی تعارف کے حوالے سے علامہ فضل حق خیرآبادی کے خاندانی حالات، علمی معرکے اور خیرآبادیات پر تحقیقی، تصنیفی و اشاعتی کام پر مشتمل یہ ایک محققانہ کتاب ہے۔ مولانا یاسین اختر مصباحی کے الفاظ میں یہ کتاب ''دنیائے علم و تحقیق میں 'خیرآبادیات' کے عنوان سے ایک وقیع تاریخی دستاویز کا اضافہ'' ہے۔ لیکن اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا خالص تحقیقی و علمی اسلوب ہے۔ فیصل آباد یونیورسٹی (پاکستان) کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی الازہری کے بقول ''......صاحبزادہ اسید الحق قادری بدایونی نے برصغیر کے ایک عظیم محسن علامہ محمد فضل حق خیرآبادی (رحمۃ اللہ علیہ) کی علمی، ادبی اور تاریخی عظمت کو خالص علمی اور تحقیقی اسلوب میں اجاگر کرتے ہوئے خیرآبادی خانوادۂ علم و فضل کے خوشہ چینوں اور آزاد برصغیر کے باسیوں کی طرف سے اجتماعی قرض چکانے کی ایک قابل قدر خدمت سرانجام دی ہے۔ فاضل مصنف نے علامہ خیرآبادی کے ساتھ گہری عقیدت کے باوجود کہیں بھی اپنے اسلوب اور لہجے کو علم و تحقیق کے دائرے سے نکلنے نہیں دیا''۔[ص:۳۱]

زیر نظر کتاب کے مطالعے کے دوران یقینی طور پر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے بڑے صبر و تحمل سے تحقیقی روش کا دامن تھامے رکھا ہے۔ مصنف نے درج ذیل ابواب کے تحت اس تحقیقی کتاب کے مواد کا احاطہ کیا ہے:

خیرالبلاد - خیرآباد، خانوادۂ خیرآباد، خانوادۂ خیرآباد کی اہل علم خواتین، مدرسۂ خیرآباد، خیرآبادی طریقۂ درس اور اس کی خصوصیات، خیرآبادی اساتذہ کی شفقت، خیرآبادی تلامذہ کی عقیدت، استاذ بھائی کا رشتہ، بدایوں میں سلسلۂ خیرآباد، کتب خانہ قادریہ میں خیرآبادی نوادر، فضل حق، فضل رسول اور آزردہ، علامہ فضل حق خیرآبادی اور حافظ محمد علی خیرآبادی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور شاہ اسماعیل دہلوی، علامہ فضل حق کے بارے میں بعض بے بنیاد روایتیں، علامہ فضل حق خیرآبادی اور سید حیدر ٹونکی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی، علامہ فضل حق

خیرآبادی کے علمی معرکے، مولانا عبدالحق خیرآبادی اور ان کے تلامذہ کے علمی معرکے، لطافِ خیرآباد، انڈمان کا ایک سفر، خیرآباد پر تحقیقی، تصنیفی اور اشاعتی کام، ضمیمہ اول، دوم، حواشی، کتابیات۔

فاضل مصنف نے اپنے ''اظہاریہ'' میں جن لوگوں کے تعاون کا شکریہ ادا کیا ہے ان میں بدایوں کے معروف محقق و ادیب ڈاکٹر شمس بدایونی بھی ہیں جنہوں نے منہج تحقیق اور اصولِ ترتیب کے سلسلے میں اپنے مطالعے اور تجربات سے فاضل مصنف کو فائدہ پہنچایا اور چند اہم کتب بھی فراہم کیں۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لاہور کے ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی ازہری نے جامعہ ازہر (مصر) سے علامہ فضل حق کی عربی شاعری پر پی ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کی جب کہ علامہ پر پہلی پی ایچ ڈی ڈاکٹر قمر النسا نے عربی مقالہ لکھ کر حاصل کی۔ 2001 میں پاکستان کی ڈاکٹر سلمہ سیہول کی کتاب ''علامہ محمد فضل حق خیرآبادی'' کو فاضل مصنف نے سراہا ہے جنہوں نے علامہ کے عربی دیوان کی ترتیب و تعلیق بھی کی ہے اور اس پر انہیں پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی تفویض کی گئی۔ مصنف نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ''خیرآبادیات'' کے سلسلے میں اگرچہ باغی ہندوستان، حکیم محمود برکاتی کی تصانیف اور مفتی انتظام اللہ شہابی کی تحریریں بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اس کتاب میں دستیاب شدہ معلومات میں کچھ اضافہ بھی ہے اور بعض ایسے مباحث، واقعات، شخصیات اور کتب و رسائل کا ذکر ہے جو شاید اس سے پہلے روشنی میں نہیں آ سکے۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علامہ فضل حق کی دختر بی بی سعید النسا حرماں خیرآبادی کا عقد احمد حسین رسوا کے ساتھ ہوا اور جن کے دو بیٹے منشی افتخار حسین مضطر خیرآبادی اور محمد حسین بسمل خیرآبادی تھے۔ معروف شاعر جاں نثار اختر، حرماں خیرآبادی کے پوتے اور مضطر خیرآبادی کے بیٹے تھے۔ علامہ کے بیٹے مولانا عبدالحق خیرآبادی کی دُختر بی بی رقیہ بھی عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ انہوں نے خواتین کے لیے قرآن حکیم کی بعض آیات کی تفسیر بھی لکھی تھی جس کا نام ''تفسیر طیبات بینات'' معروف بہ ''صراط مستقیم'' ہے۔

مدرسہ خیرآباد کا نصاب تعلیم اگرچہ درس نظامی کے طرز پر تھا لیکن حکیم محمود احمد برکاتی کا قول ہے کہ خیرآباد کے نصاب تعلیم کو ''نظامی خیرآبادی'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیوں کہ اس میں کچھ

خیرآبادی علما کی کتابیں بھی داخل کی گئی تھیں۔ مدرسۂ خیرآباد سے علامہ فضل حق کے بے شمار تلامذہ نے درس وتدریس میں نمایاں مقام حاصل کیا لیکن جن عناصر اربعہ کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ان میں علامہ کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی، تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی، استاذ العلما مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی درسگاہیں شہرۂ آفاق خیال کی جاتی ہیں۔

فاضل مصنف کے بقول علامہ فضل حق نے 1240 ہجری میں شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب ''تقویت الایمان'' کی ایک عبارت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے خلاف فتویٰ کفر صادر فرمایا جو ''تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس فتوے پر دہلی کے مشاہیر علما مولانا مخصوص اللہ دہلوی، مولانا محمد موسیٰ دہلوی، مولانا احمد سعید نقشبندی اور مفتی صدر الدین آزردہ نے دستخط ثبت کیے۔ اسی طرح علامہ کی ایک اہم علمی کتاب ''امتناع النظیر'' بے حد مشہور ہوئی۔ کتاب کا یہ قلمی نسخہ بڑی تقطیع کے 284 صفحات پر مشتمل ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کا ایک اہم علمی معرکہ ''تقویت الایمان'' کے مصنف شاہ اسماعیل شہید دہلوی (1779-1831) سے ایک عرصے سے متنازعہ ہے۔ علامہ نے اس کتاب کی ایک مخصوص عبارت پر اولین صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ شفاعت کے بیان کے ضمن میں اللہ کی قدرتِ عامہ کا ذکر کرتے ہوئے شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ''تقویت الایمان'' میں درج ذیل عبارت لکھی تھی:

> ''اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُــــن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن فرشتے جبرئیل اور محمد ﷺ کے برابر پیدا کر ڈالے''۔

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ تقویت الایمان میں صرف یہی ایک عبارت قابل اعتراض نہیں تھی جس پر علامہ نے گرفت کی بلکہ اس کی اور بہت سی عبارتیں علمائے وقت کے لیے تشویش کا باعث بن گئیں اور [ص:۳۲] یہی تشویش بالآخر اس تاریخی مناظرے کا سبب بنی جس میں بقول مولانا آزاد ''ایک طرف مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحئی تھے اور دوسری طرف تمام علمائے دہلی''۔ یہ

مناظرہ جامع مسجد دہلی میں 1824 میں یعنی ۲۹؍ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو منعقد ہوا۔ مسئلہ امتناع النظیر اور ''امکانِ نظیر'' کی اس پے چیدہ بحث کو ''تحقیق الفتویٰ'' کے حوالے سے مصنف نے اس کتاب میں بڑے سلیقے سے ترتیب وار پیش کیا ہے۔ مصنف کا یہ خیال بجا ہے کہ علامہ اور شاہ اسماعیل کے درمیان ہونے والا اختلاف اس قدر دقیق علمی نکات پر مشتمل ہے کہ اس کی تہ تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے، جب تک علم کلام و عقائد کی اصطلاحات سے گہری واقفیت اور اصول شرعیہ وفقہیہ پر خاطر خواہ نظر نہ ہو، اس اختلاف کی نزاکت، اہمیت اور حساسیت تک آدمی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے وہ حضرات جن کی نظر علوم دینیہ میں گہری اور پختہ نہیں ہوتی وہ عام طور پر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ تحقیقی کتاب بلاشبہ سلسلۂ خیرآبادیات میں ایک گراں قدر اضافہ اور اس موضوع پر حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ [ص:۳۳]

(سہ ماہی اردو بک ریویو، دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۳۱؍تا ۳۳؍)

☆☆☆

# خیرآبادیات

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

یامین انصاری

☆

خیرآبادی سلسلۂ علم وفضل کا آغاز تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں ہوتا ہے، مولانا فضل امام خیرآبادی (متوفی ۱۸۲۹ء) نے اس سلسلۂ علم وفضل کی بنیاد ڈالی، ان کے بعد ان کے علمی جانشین اور فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۸۶۱ء) نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، یہاں تک کہ لفظ ''خیرآباد''، علم وفضل، فلسفہ وحکمت اور منطق وکلام کے لیے ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ خانوادۂ خیرآباد اور مدرسۂ خیرآباد کے فرزندان وفضلا نے گذشتہ تقریباً ڈیڑھ صدی میں امت اسلامیہ ہند پر اپنے فکری، علمی اور نظریاتی اثرات مرتب کیے ہیں۔ برصغیر ہند وپاک کے اہل علم وفضل کا ایک بڑا طبقہ مدرسۂ خیرآباد سے تعلیمی اور فکری طور پر وابستہ رہا ہے۔ زیرنظر کتاب ''خیرآبادیات'' میں اسی سلسلۂ علم وفضل کے احوال وآثار کو جمع کرکے گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے قصۂ پارینہ کی یاد تازہ کی گئی ہے۔ مرتب کتاب خود بھی اسی سلسلۂ علم وفضل کے تسلسل کی ایک کڑی ہیں، جو مدرسۂ خیرآباد سے علمی وفکری وابستگی رکھنے کے ساتھ ایک معروف علمی وروحانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا اسید الحق قادری بدایونی کا نام اب علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں رہا۔ انہوں نے تحقیقی گہرائی، تنقیدی شعور اور شگفتہ اسلوب کی وجہ سے بہت کم عرصے میں علمی حلقوں میں اعتبار واستناد حاصل کیا ہے۔

کتاب کے بعض مشمولات یہ ہیں: خیرآباد کا تاریخی تعارف، خانوادۂ خیرآباد کے اہل علم نامور رجال، خانوادۂ خیرآباد کی اہلِ علم خواتین، مدرسۂ خیرآباد کا نصابِ تعلیم اور درس کی خصوصیات، مدرسۂ خیرآباد کے عناصرِ اربعہ، اساتذۂ مدرسہ خیرآباد کی شفقت، طلبہ کی عقیدت، استاذ بھائی کا رشتۂ اخوت، کتب خانۂ قادریہ بدایوں میں نوادرِ خیرآباد، علامہ فضل حق خیرآبادی، علامہ فضل رسول بدایونی اور مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کے روابط وتعلقات، علامہ فضل حق خیرآبادی اور

شاہ اسمٰعیل دہلوی، علامہ خیرآبادی کے بارے میں بعض بے بنیاد روایات کا تحقیقی جائزہ، علامہ خیرآبادی اور سید حیدر علی ٹونکی، علامہ خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی، علامہ خیرآبادی کے کچھ علمی معرکے، علامہ کے فرزند علامہ عبدالحق خیرآبادی کے علمی معرکے، لطائف خیرآباد، جزیرۂ انڈمان کا ایک سفر، خیرآبادیات پر تحقیقی، تصنیفی واشاعتی کام کا جائزہ۔

مرتب کتاب نے کتاب کے ''اظہاریہ'' میں دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے خیرآبادیات پر اب تک کی دستیاب شدہ معلومات میں اضافے کی کوشش کی ہے، کتاب کے مندرجات کا مطالعہ کرکے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں، اس کامیابی کا اندازہ کتاب کے آخر میں دی ہوئی کتابیات کی فہرست سے بھی ہوتا ہے۔ کتاب کی ترتیب میں ۱۴؍عربی، ۶؍فارسی، ۱۵؍اُردو اور ۱۷؍قلمی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ مرتب کے بقول ''ان میں کم از کم ایک درجن نایاب قلمی نسخے ایسے ہیں جن کا ذکر پہلی بار منظرِ عام پر آرہا ہے''۔

کتاب پر تین اہل علم اور اور خیرآبادیات کے ماہرین نے تقریظات بھی لکھی ہیں، ڈاکٹر سلمہ سیہول لکھتی ہیں کہ ''خیرآبادیات علمی دیانت و امانت اور جدید اصولِ تحقیق پر مبنی پُرخلوص، مفید، معلومات افزا کاوش ہے''۔ مولانا یٰسین اختر مصباحی نے اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے کہ ''خیرآبادیات ایک محققانہ، فاضلانہ اور مؤرخانہ دستاویز ہے جسے ہند و پاک کے اہل علم وفضل نہ صرف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے بلکہ اسے خیرآبادیات کا ایک گراں قدر مجموعہ اور بیش قیمت مرقع قرار دیں گے''۔

کتاب کے مندرجات پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے موضوع کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگرچہ مصنف علامہ فضل حق خیرآبادی سے گہری عقیدت رکھتے ہیں، اس کے باوجود انہوں نے کہیں بھی جذبات عقیدت میں حقیقت پسندی اور انصاف و دیانت کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنے قلم کو کہیں بھی علم وتحقیق کے دائرے سے نکلنے نہیں دیا ہے۔

کتاب میں کئی جگہ علامہ فضل حق خیرآبادی کے نظریاتی اور مسلکی مخالفین کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے، نیز برصغیر میں ہونے والے مسلکی اور نظریاتی اختلافات کا تذکرہ بھی ہے۔

ایسے مقامات پر عموماً جذبات برافروختہ ہو جاتے ہیں اور مصنف کا قلم تنقید سے نکل کر تنقیص کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔مگر ایسے نازک مقامات پر بھی مولانا اسید الحق نہایت متانت اور سنجیدگی سے گزرے ہیں، انہوں نے اسلوب کو سنجیدہ، علمی اور شائستہ رکھتے ہوئے دلائل وشواہد سے اپنا موقف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب یقیناً سلسلۂ خیرآباد کی تاریخ، خدمات اور علمی اثرات کی تفہیم کے سلسلے میں میل کا پتھر ہے، جس سے طویل عرصے تک اہل علم اور اسکالرز استفادہ کریں گے۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، ۲۰/نومبر ۲۰۱۱ء بروز اتوار)

☆☆☆

# خیرآبادیات

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

مولانا صادق رضا مصباحی

☆

اسے بدقسمتی کہیے یا عصری ماحول کا جبر کہ اب دین کے نام پر نام ونمود اور ریا ونمائش کی حد درجہ گرم بازاری ہے۔ لگتا ہے کہ مؤخر الذکر کی حیثیت اولی ہے اور اول الذکر کی حیثیت ثانوی۔ دین کے نام پر دنیا کمانے والے ہر مکتب فکر میں پائے جاتے ہیں انہیں ان کی دنیا تو مل جاتی ہے مگر دین کو اس کا جائز اور صحیح حق نہیں مل پاتا۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب علما وقائدین محض رضائے الٰہی کی خاطر قوم وملت کی خدمات انجام دیتے تھے، شہرت کے حصول کو وہ بے معنی سمجھتے تھے۔ جنگ آزادی میں بھی یہی ہوا، ہمارے علما نے بے لوث ہو کر وطن عزیز کو انگریزوں سے پاک کرایا اور اپنے تن من دھن سے وطن عزیز کے لیے قربانیاں پیش کیں۔ ان کی قربانیوں اور جاں فشانیوں کی کوئی تاریخ مرتب نہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بے لوث خدمات اور غیر معمولی قربانیوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو مجاہد جنگ آزادی بنا کر پیش کیا گیا جو انگریزوں کے نہ صرف یہ کہ دوست تھے بلکہ اس دوستی کے عوض ان سے وظیفے بھی حاصل کرتے تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اسی تاریخ سازی کے شکار ہوئے۔ جنگ آزادی کے اس سرخیل کو اگر مجاہدین آزادی کی صف سے خارج کیا جاتا تب بھی صبر آجاتا۔ تاریخ سازوں نے ان کی خدمات اور قربانیوں کو ہی مشکوک قرار دے دیا۔ اس پوری تحریک کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جنگ آزادی کے علما ومشائخ اگر اپنی قربانیوں کی تاریخ مرتب کراتے تو یقیناً جنگ آزادی کی تاریخ میں کتربیونت نہ کی جاتی مگر چونکہ ان کے نزدیک کام کی اہمیت زیادہ تھی نام کی نہیں، جس کا فائدہ یار لوگوں نے اس طرح اٹھایا کہ پوری تاریخ ہی الٹ ڈالی۔

اس سے ہمیں ایک سبق یہ ضرور ملتا ہے کہ اخلاص اور نمائش دونوں ضروری ہیں مگر نمائش بالذات نہ ہو۔ یہ دور چوں کہ نمائش کا زیادہ ہے اس لیے آج اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہوگئی

ہے، ورنہ جنگ آزادی کے اصل قائدین کی طرح ہماری سرگرمیاں بھی تاریخ کے اندھیرے میں گم ہوجائیں گی اور دوسرے لوگ میدان خالی پاکر اس پر قابض ہوجائیں گے۔

تاریخ کے اس سیاہ جرم کے خلاف حقائق کو واشگاف کرنے اور علامہ فضل حق خیرآبادی کی خدمات کا اُجاگر کرنے کے لیے معروف عالم دین مولانا یٰسین اختر مصباحی نے ایک سال قبل ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور اس منصوبے کو عمل سے مربوط کرنے کے لیے پورے ملک میں کانفرنس، سیمینار اور سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا اور آج بھی اس کوشش کی توسیع کا سلسلہ جاری ہے۔ اس موضوع پر مقالات و مضامین لکھے اور لکھوائے گئے اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ اسی سلسلۂ خیر کی اہم ترین اور معرکہ آرا کتاب ''خیرآبادیات'' ہے، جو برصغیر کے معروف عالم ومحقق اور خوش اسلوب قلم کار مولانا اسید الحق قادری ازہری کے خامۂ زرنگار کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں علامہ فضل حق خیرآبادی کے حوالے سے متعدد پہلوؤں پر علمی اور تحقیقی بحث کی ہے اور انہیں حقائق کے اجالے میں لا کھڑا کیا ہے، اس کتاب میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی حیات کے دیگر بہت سارے پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کر کے انہیں روشن سے روشن تر کر دیا ہے۔ ان کی پوری گفتگو مضبوط دلائل سے آراستہ ہے۔ ۲۶۴؍صفحات کی یہ کتاب علم وفکر اور تحقیق وتفتیش کا حسین مرقع ہے اور خیرآبادیات کے طالب علموں کے لیے ایک اہم ترین اور غیر معمولی تحفہ۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف ''شیریں'' کے حصول کی خاطر ''کوہ کنی'' کے عمل سے گزرے ہیں اور ''شیریں'' کو گلے لگانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب کے ابواب پر ایک نظر ڈالیں اس سے اس کی وقعت کا اندازہ ہوگا۔

خیرالبلاد، خیرآباد، خانوادۂ خیرآباد کی اہل علم خواتین، مدرسۂ خیرآباد، خیرآبادی طریقۂ درس اور اس کی خصوصیات، خیرآبادی اساتذہ کی شفقت، خیرآبادی تلامذہ کی عقیدت، استاذ بھائی کا رشتہ، بدایوں میں سلسلۂ خیرآباد، کتب خانۂ قادریہ میں خیرآبادی نوادر، فضل حق، فضل رسول اور آزردہ، علامہ فضل حق خیرآبادی اور حافظ محمد علی خیرآبادی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور شاہ[ص:۴۶] اسماعیل دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی کے بارے میں بعض بے بنیاد روایتیں، علامہ فضل حق خیرآبادی اور سید حیدر علی ٹونکی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی، علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی معرکے، مولانا عبدالحق خیرآبادی اور ان کے تلامذہ کے علمی

معرکے، لطائف خیرآباد، انڈمان کا ایک سفر، خیرآبادیات پر تحقیقی، تصنیفی اور اشاعتی کام۔

علامہ فضل حق خیرآبادی اور ان کے خیرآبادی سلسلۂ علم وفضل کے تذکرے پر مشتمل یہ کتاب ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ جو باتیں پہلے لکھی جا چکی ہیں ان کو چھیڑا نہیں گیا ہے بلکہ تکرار واعادے سے الگ ہٹ کر کچھ نئے مباحث سامنے لائے گئے ہیں۔ بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہی ہیں۔ بقول مصنف:

> مَیں نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ خیرآبادیات کے سلسلے میں اب تک دستیاب شدہ معلومات میں کچھ اضافہ کرسکوں۔ اس کتاب میں آپ کچھ ایسے مباحث، واقعات، شخصیات اور کتب و رسائل کا ذکر پائیں گے جو شاید اس سے پہلے روشنی میں نہ آ سکے۔ مثال کے طور پر علامہ کی مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولانا شاہ فضل رسول بدایونی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے ساتھ قلمی معرکہ آرائی کی تفصیلات غالباً پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہی ہیں۔ شاہ اسماعیل دہلوی اور سید حیدر علی ٹونکی سے علامہ کے اختلاف اور مناقشات کا تذکرہ تو بہت ہوا مگر تاریخی ترتیب کے ساتھ تحقیقی انداز میں اس پر کم لکھا گیا ہے۔ مَیں نے اس اختلاف کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے بہت سے نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔ اگر کچھ مشہور و معروف مباحث اور واقعات کا ذکر کتاب میں کیا گیا ہے تو یا تو انہیں کسی نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے یا پھر ان پر بعض شکوک وشبہات ہوں گے جن کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کا جس طرح تعارف کرایا جانا چاہیے تھا، نہیں کرایا جا سکا۔ قابل مبارک باد ہیں وہ حضرات جو یہ تحریک لے کر اٹھے ہیں اور ان کی ایما پر پورے ملک میں علامہ کی یاد منائی جا رہی ہے اور نئی نسلوں کو ان کی خدمات سے آشنا کرایا جا رہا ہے، مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے بعض اپنوں کو یہ تحریک ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ اس تحریک کو بھی شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور حاملانِ تحریک کو بھی طعن وتشنیع سے گھائل کر رہے ہیں۔ ہماری جماعت کا المیہ یہ ہے کہ اس کی اکثریت اب تک بالغ نظر نہیں ہوسکی ہے حالانکہ یہ اپنی بلوغیت کے دعوے تو بہت کرتی ہے اور معاصر حالات سے اچھی طرح باخبر بھی ہے مگر پھر بھی پتہ نہیں کیوں وہ اپنی عدم بلوغیت کے

اشارے دے دیتی ہے۔ بہر حال ہمیں ان سب منفی باتوں پر کان نہیں رکھنا چاہیے اور اپنے تعمیری، ملی اور مسلکی کاموں کی رفتار تیز سے تیز تر کر دینا چاہیے۔

مولانا اسید الحق قادری نے ''خیر آبادیات'' کے تعلق سے اپنی کتاب میں جس عنوان کو بھی مس کیا ہے اس پر سیر حاصل اور تحقیقی انداز میں گفتگو کی ہے اور الجھے ہوئے قارئین کو مطمئن کرنے اور نئی نسل کو علامہ اور خیر آبادی سلسلے کی غیر معمولی اور حیرت انگیز علمی قدر و منزلت سے روشناس کرانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو بھی منتخب کرتے ہیں تو اس کے مالہ و ماعلیہ کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی علمی استعداد، فکری اٹھان، تحقیقی شعور، قلمی پختگی نیز فنی کمال نے انہیں برصغیر کے ممتاز علما، محققین اور قلم کاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ ہاں یہ بات کچھ حد تک صحیح ہے کہ ان کی شہرت و عظمت کو پر پرواز عطا کرنے میں ان کی اس خانقاہ کا بھی ہاتھ ہے جس کے وہ علمی وارث ہیں مگر ہماری نظر میں صرف وابستگی ہی کافی نہیں ہوتی اور اس طرح کی وابستگی باپ دادا کے مریدین اور عقیدت مندوں میں تو عزت کا سبب بن سکتی ہے، پڑھے لکھے حلقوں میں نہیں۔ انہوں نے جو عظمت حاصل کر کے اپنی کلاہ افتخار میں چار چاند لگائے ہیں وہ ان کی علمی صلاحیتوں کی مرہون منت ہے۔ اگر وہ کسی خانقاہ سے وابستہ نہ بھی ہوتے تو علم و فضل نے ان کو اتنا مستحکم کر دیا ہے کہ وہ خود اپنا مقام بنا لیتے۔ اب دھیرے دھیرے مولانا کی شخصیت خود مستند حوالہ بنتی جا رہی ہے۔

مولانا موصوف نے یہ اہم اور معرکہ آرا کتاب تحریر کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف یہ کہ ذہن و فکر کو روشن کرے گا بلکہ بہت سارے چھپے ہوئے حقائق سے بھی پردہ اٹھائے گا۔ اتنی اہم ترین کتاب لکھنے پر مولانا موصوف پوری جماعت کی جانب سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ مولانا موصوف اسی طرح کی علمی و تحقیقی کتابیں منظر عام پر لاتے رہیں۔ کتاب کے حصول کے لیے تاج الفحول اکیڈمی مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں یوپی اور مکتبہ جامِ نور ۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد دہلی سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ [ص: ۴۷]

(ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی مارچ ۲۰۱۲ء، ص: ۴۶/ ۴۷)

☆☆☆

# عربی محاورات مع ترجمہ وتعبیرات

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی

☆

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ زبان صرف قواعد وگرامر کے علم ،لغوی تبحر اور ترکیبی باریک بینی سے نہیں آتی ہے بلکہ سلاست وروانی اور فصاحت کے ساتھ لکھنے اور بولنے کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ اہل زبان کو بولتے ہوئے سنا جائے اور اسی زبان کے لٹریچر کا کثرت وباریک بینی سے مطالعہ کیا جائے اور جو تعبیرات حاصل ہوں یا تو ان کو ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ کر کے اسی کو بار بار ذہن میں دہرایا جائے یا پھر نوک قلم سے ان کا شکار کر کے ان کو پابند سلاسل کر دیا جائے تاکہ بوقت ضرورت ان کا استعمال کیا جائے۔تعبیرات کے ضمن میں خصوصیت کے ساتھ چند چیزیں کسی بھی زبان میں بہت اہم ہوتی ہیں (۱) صلات والے افعال (Phrasal Verb) (۲) محاورات (Idioms) (۳) امثال وحکم (Proverb & Sayings) کسی بھی زبان کے لیے عموماً اور عربی زبان لکھنے اور بولنے والے کے لیے خصوصاً ان تینوں سے وافر حصہ ہونا ضروری ہے۔ غیر عرب حضرات کو عربی سکھانے کے لیے مختلف کوششیں ہوئیں اور جب تک زبان زندہ ہے تب تک کوششیں ہوتی رہیں گی۔ ہندوستانیوں کو عربی سکھانے اور زبان کی باریکیوں سے آگاہ کرانے کی غرض سے بھی مختلف کامیاب کوششیں مختلف ڈھنگ سے ہوئی ہیں اور ان کا بھی سلسلہ جاری ہے۔اسی ضمن کی ایک کاوش ’’عربی محاورات‘‘ کے نام سے اس وقت میرے مطالعے کی میز پر ہے جو مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی کے قلم سے وجود میں آئی ہے۔

یہ کتاب ایک اظہاریہ، تین تقاریظ اور پھر مرتب کے ایک علمی مقدمے پر مشتمل ہے، جس میں مؤلف نے عربی اردو محاورات سے متعلق تحقیقی اور تجزیاتی گفتگو کی ہے۔محاورے اور ضرب الامثال میں ہونے والے خلط مبحث کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نو آموز مترجمین کے لیے

نافع ہوگا۔علاوہ اس کے اور بھی دوسرے عمدہ مباحث ہیں جومحاورات سے واقفیت حاصل کرنے والوں کے عموماً اور عربی محاورات سے آشنائی حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصاً لازمی مطالعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے، اصل کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے: باب اول میں ان محاورات کو ذکر کیا گیا ہے جن کا پہلا جز فعل ہے، باب دوم میں ان محاورات کو بیان کیا گیا ہے جن کا پہلا جز اسم یا حرف ہے۔محاورات کو حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے، لیکن عربی مادے کا خیال نہیں کیا گیا ہے جیسا عام عربی ڈکشنری کے مرتبین کی روش رہی ہے بلکہ جدید مرتبین کے طریقے پر محاورے کے پہلے لفظ کا اعتبار کیا گیا ہے۔

مقدمے میں محاورات اور ضرب الامثال میں خلط مبحث کے عنوان سے جو بحث کی گئی ہے اس ضمن میں محاورہ اور مثل کے درمیان فرق کرنے کے لیے یہ بات اہم ہے کہ مثل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور محاورات کے صیغوں میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی ہے۔محاورات کی تعریف میں Oxford's Advanced Learner's English Dictionary میں لکھا ہے:

"A group of words whose meaning is different from the meaning of the individual words." (P:770)

ترجمہ: الفاظ کا ایسا مجموعہ جس کا معنی اس کے مفرد الفاظ کے معانی سے مختلف ہو۔

اس تعریف میں محاورے کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ الفاظ کا مجموعہ ہو جو کم از کم دو پر مشتمل ہوگا۔اس اعتبار سے محاورے کی یہ تعریف عربی محاورے کی تعریف سے مختلف ہے کہ اس میں محاورہ یک لفظی بھی ہوسکتا ہے، لیکن اس اعتبار سے یہ تعریف عربی محاورے کی تعریف کے موافق ہے کہ انگریزی محاورہ بھی مرکب اضافی اور مرکب توصیفی ہوسکتا ہے۔

مثل کو محاورے سے اس طرح الگ کیا گیا ہے:

"A well known phrase or sentence that gives advice or says that is generally[ص:۲۱] true." (P:1215)

اس سے بھی چند باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں: پہلی یہ مثل کوئی جملہ ہوگا دوسری یہ مثل حقائق و نصائح پر مشتمل ہوں گے، اب اس طرح کے جملوں کو اگر ان کے مخالف مواقع پر مجازاً استعمال کیا جا رہا ہے تو یہ امثال ہوں گے اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ استعمال مجازی ہے اور مثل کی دوسری

خصوصیات نہیں ہیں تو یہ محاورہ ہوگا۔
یہ تو چند باتیں محاورات وامثال کے ذیل میں رہیں۔
کتاب میں قرآنی محاورات، قدیم محاورات، جدید محاورات اور معرب محاورات پر بھی اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ بعض محاورات کے پس منظر پر مثالوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ محاورات و امثال سے متعلق کی گئی مختلف جہاتی گفتگو سے یقینی طور پر طالبان علوم عربیہ کو عربی محاورات وامثال کی اچھی طرح تفہیم ہو سکے گی اور ان کا واضح تصور سامنے آئے گا۔ البتہ مقدمے سے متعلق میری چند معروضات ہیں۔ پہلا یہ کہ ڈاکٹر احمد علی ہمام کے حوالے سے محاورے کی جو تعریف کی گئی ہے وہ اس طرح شروع ہوتی ہے:

**التعبير الاصطلاحی یمکن ان یتکون من کلمتین او اکثر**
**(ص ۲۷)**

اور اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

**التعبير الاصطلاحی** ایک کلمے یا ایک سے زیادہ کلمات سے وجود میں آتی ہے۔

جب کہ درحقیقت ترجمہ یہ ہونا چاہیے تھا: ''**التعبير الاصطلاحی** دو کلمے یا دو سے زیادہ کلمات سے وجود میں آتی ہے''۔ اس مقام پر کاتب یا پروف ریڈر نے غلطی سے یا تو ''**کلمة**'' کو **کلمتين** کر دیا ہے یا پھر ترجمے میں ''دو کلمے'' کے بجائے ''ایک کلمے'' کاتب نے لکھ دیا اور اس کی تصحیح ہونے سے رہ گئی، لیکن سیاق یہ بتا رہا ہے کہ یہاں ڈاکٹر احمد علی ہمام کی تعریف میں ''**کلمتين**'' ہی تھا کیوں کہ آگے مؤلف نے لکھا ہے:

مگر عربی میں **التعبير الاصطلاحی** کے لیے یہ قید نہیں ہے کیونکہ یہ کبھی یک لفظی بھی ہوتی ہے۔ (ص: ۲۷)

دوسرا یہ کہ جہاں قدیم محاورات کی تقسیم کی گئی ہے وہاں پہلی قسم ان محاورات کی بتائی گئی ہے جو اب متروک ہیں اگر ایک دو پیراگراف میں ان پر گفتگو کر کے ان کی کچھ مثالیں پیش کر دی جاتیں تو بحث اور مکمل ہوتی۔ یہاں پر مجھے یک گونہ تشنگی معلوم ہوئی۔

تیسرا یہ کہ مغربی ماہر لغت ''سستنکیفیش'' میری معلومات کی حد تک یہ کوئی مستشرقہ ہیں جنہوں نے قدیم عربی پر مختلف زاویوں سے گفتگو کی ہے، ان کا پورا نام پیٹرک سوزان ستنکیفیش ہے اور ان کے نام کا تلفظ شاید کچھ اس طرح ہے (Patrick Susan Sttkeevece)

کتاب کا وہ حصہ جو محاورات پر مشتمل ہے خاص دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔ محاورات کو مثالوں سے مزین کر دیا گیا ہے اور مؤلف کو جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں انہوں نے کچھ توضیح بھی پیش کر دی ہے۔ اگر چہ جتنے محاورات کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں ان کو معتد بہ کہا جا سکتا ہے اور طالبان علوم عربیہ اگر اسے اپنے خزانہ دماغ میں جمع کر لیں تو ان کی عربی تحریر و تقریر میں اس کا نمایاں اثر ظاہر ہوگا اور وہ شائستہ تحریر لکھنے اور بولنے کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے لیکن اس کے باوجود جمع کردہ محاورات عربی زبان کی وسعت کے لحاظ سے یقیناً ''مشتے نمونہ از خروارے'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مؤلف محترم سے میری ایک گزارش ہے کہ تعبیرات نوٹ کرنے کے سلسلے کو وہ جاری رکھیں اور ہر نئے ایڈیشن میں اضافے کرتے رہیں۔ اس سے محاورات کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا رہے گا اور طالبان علوم عربیہ کو بڑا فائدہ ہوگا۔ ان محاورات کے مطالعے کے بعد خود طالبان علوم عربی کے اندر ذوق بیدار ہوگا اور وہ کسی بھی کتاب کا مطالعہ سرسری نہیں کریں گے بلکہ مؤلف کتاب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ تعبیرات نوٹ کرنا شروع کریں گے اور اسی طرح قطرہ قطرہ دریا ہو جائے گا۔

کتاب میں ذکر کردہ محاورات کی جو مثالیں دی گئی ہیں ان پر یقیناً عراق امریکہ کا غلبہ ہے، جس کے لیے مؤلف نے پہلے سے ہی معذرت کر لی ہے۔ لیکن میرے خیال میں ترتیب و نظر ثانی کے دوران اگر ان مثالوں میں تنوع پیدا کر دیا جاتا تو بہتر ہوتا، اس لیے کہ خاص طور پر طلبہ مدارس کی ایک ذہنیت ہے کہ ان کو جس طرح کی مثالیں کتاب میں لکھی ملتی ہیں اسی ڈھنگ سے پھر وہ ساری مثالیں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح ان کا زاویہ فکر یک رخی ہو جاتا ہے۔ مثالوں میں تنوع کی صورت میں ان کے بھی فکری دریچوں کے کھلنے کی امید تھی۔

ویسے مثالیں عموماً طلبہ کے مزاج سے ہم آہنگ اور تربیتی انداز کی بھی ہیں۔

محاورات کے ضمن میں پیش کردہ بعض مثالیں بہت پسند آئیں، مثلاً من عركه الدهر صار

من الصعب خداعه (ص:۱۳۰)،الی متی یعیش العالم العربی تحت رحمة امریکا (ص:۱۷۳)،[ص:٦۲]اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔بعض مثالوں میں مجھے تکلف بھی محسوس ہوا، ایسا لگا کہ شاید ان مثالوں کو کچھ آسان بنایا جا سکتا تھا، اگر چہ مَیں اس بات پر مصر نہیں کہ ان میں واقعی تکلف ہے بھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسا خود میری کور ذوقی کا شاخسانہ ہو۔بعض مثالیں ایسی ہیں جن کے مادے سے قرآن حکیم میں مثالیں موجود ہیں لیکن مؤلف نے اس کی مثال قرآن سے نہیں پیش کی ہے،مثلاًفاضت عیناہ (ص:۱۳٦)قرآن کریم میں ہے:واذا سمعوا ماانزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع (المائدۃ)۔دوسرے مقام پر ہے:وأعینهم تفیض من الدمع حزنا الا یجدو ما ینفقون (التوبۃ)اسی طرح عمی قلبه (ص:۱۳۱)کے ضمن میں بھی قرآنی مثال نہیں ہے جب کہ قرآن میں ہے:لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور. ان کے علاوہ بعض مقامات پر میری نگاہ ٹھہر گئی مثلاًص:۵۷ پر لکھا ہے:دائما ما احرزت جریدة شایداس میں ''ما''زائد ہےاور غلطی سے درآیا ہے،اوراگر''ما''حینما اور طالما کی طرح ہے یا تفہیم کے لیے ہے تو میرے نظر سے ابھی تک''دائماما'' کی نظیر نہیں گزری، یہ پہلی بار ہے۔بعض مثالوں میں افعال کا استعمال ماضی یا مضارع کی شکل میں کیا گیا ہے لیکن اس کا ترجمہ اس کے برعکس کیا گیا ہے،مثلاًعندما یرخی اللیل سدوله خرج الجیش لیغار علی عدوّه. اس کے ترجمے میں ہے: جب رات گہری ہوگئی تو لشکر اپنے دشمن پر شب خون مارنے نکلا(ص:۸۰)

اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں،دیکھیں ص:۸۸،أنار له الطریق ص:۱۲٦،طأطأرأسک ص:۱۴۲،لایالو الاستاذ جهداً کے ضمن میں۔

اسی طرح''لفظ انفاسه''کے ضمن میں''لفظ''باب تفعیل سے ذکر کیا گیا ہے جب کہ محاورے میں'لفظ' میرے علم کی حد تک مجرد سے ہی مستعمل ہے،اس کے علاوہ اور بھی پروف کی غلطیاں نظر آئیں مثلاً''غزی''(ص:۹٦)اس کا تلفظ الف سے ہے۔قرن العشرین (ص:۱۱۷) کی بجائے القرن العشرین ہونا چاہیے۔اسرار الکونیة (ص:۱٦۱)کے بجائے الاسرارالکونیة درست ہے۔المطالبة تطویر (ص:۱۸۷) کی بجائے المطالبة

بتطویر صحیح ہے۔المیزان الانسانیة کی بجائے میزان الانسانیة درست ہے۔أنھار (ص:۲۰۰) غلط ہے اور ''اِنھار'' صحیح ہے، اسی طرح ''قارب'' (ص:۲۰۰) غلط اور ''قارِب'' صحیح ہے، اسی طرح الذی تقدم امریکا (ص:۲۰۳) کی بجائے تقدمه امریکا ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح کی کچھ پروف کی کمیاں ہیں ورنہ یہ کتاب یقیناً اہل سنت و جماعت کے طلبہ کے لیے خصوصاً اور علوم عربیہ کے طالبان کے لیے عموماً نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اسی ڈھنگ کی ایک کتاب ''منتخب تعبیرات'' کے نام سے علاء الدین ندوی صاحب کی بھی ہے لیکن اس میں کوئی علمی بحث اور وضاحتیں نہیں ہیں۔ پھر اس کا دائرہ انتخاب محاورات تک محدود نہیں ہے بلکہ متنوع قسم کی منتخب تعبیرات کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب سے جہاں طلبہ کی تحریری اور تقریری صلاحیت بیدار ہوگی وہیں ترجمے کی باریکیوں کی طرف ان کی توجہ مبذول ہوگی اور مقارناتی ادب کے لیے بھی ان کے ذہن وفکر کے دروازے وا ہوں گے۔ یہ اپنے آپ میں ایک مختصر اور تحقیقی کام ہے۔ اب میں اس انتظار میں ہوں کہ کوئی مرد میدان اٹھے اور اس طرح عربی منتخب تعبیرات کی کوئی ایسی کتاب ترتیب دے جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کی بھی متبادل تعبیرات جمع کر دی گئی ہوں۔ اس کتاب سے میں نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور کئی مقام پر خود میں نے بھی اپنی تصحیح کی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری طرح دوسرے لوگوں کے لیے رہنما اور عربی زبان کا سلیقہ سکھانے والی ہوگی اور بہت جلد ہر سطح کے طالبان علوم عربی کے مطالعے کی میز پر نظر آئے گی۔[ص:۶۳]

(ماہنامہ جام نور دہلی، جنوری ۲۰۱۲ء ص ۶۱ر تا ۶۳ر)

☆☆☆

# تحقیق و تفہیم

## مولانا اسید الحق قادری بدایونی

مولانا نورین علی حق

☆

یادش بخیر! لکھنؤ کے قیام کے دوران ہم کسی جمعرات کو حضرت ٹیلہ شاہ پیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے، جب کچھوچھہ شریف میں منعقد ہونے والی کسی کانفرنس کے نہایت جاذب نظر اور خوبصورت اشتہار کے درمیانی مقام پر پہلی مرتبہ مَیں نے ایک نام دیکھا تھا، جس نام کے بعد ''قادری ازہری'' کے لاحقے اسے مزید چار چاند لگا رہے تھے۔ اس نام کو صرف دیکھنے سے مَیں اپنائیت اور انسیت محسوس کر رہا تھا۔ نانا جان حضرت مولانا شاہ احتشام الدین فریدی سہسرامی علیہ الرحمۃ کی زبانی بارہا حضرت مولانا عبدالقدیر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ سننے کے باوجود اس نام سے اپنی ناواقفیت کے اظہار کے بعد میرے رفیق و ہم درجہ مولانا نبیل اختر خان نوازی نے مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کے کارنامے بیان کرنے شروع کیے تو میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ وہی دور شباب تھا جب موصوف اپنے قلمی نام ابوالفیض معینی سے جام نور کے صفحات پر خامہ تلاشی کر رہے تھے اور پورے سنی و خانقاہی حلقے میں موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ عام قارئین موصوف کے علاوہ کسی اور کو ابوالفیض معینی سمجھ رہے ہوں، لیکن نبیل اختر نے اسی وقت پورے وثوق کے ساتھ قیاس آرائی کی تھی کہ ابوالفیض معینی ہو نہ ہو مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری ہی ہیں، جو بعد میں سچ ثابت ہوئی۔ پھر اپنے رفیق کی تحریک پر مَیں نے بھی جامِ نور کا مطالعہ شروع کیا۔ اپنی کم علمی و بے بضاعتی اور خانقاہوں سے اپنی واقفیت کی حد تک آج یہ کہہ سکتا ہوں کہ خانقاہوں کے علم و فضل سے لیس اور متحرک و فعال شاہزادگان کی نئی نسل میں مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کا نام خط امتیاز کھینچتا ہے۔ فن حدیث، فن تفسیر، فن تحقیق، فن تنقید ان تمام فنون پر مولانا کا قلم یکساں چلتا ہے۔ جب ہم ان کے قلمی سفر پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ موصوف ''جو چھپے دل کو وہی تنکے لیے'' کے اصول پر تحقیق کو اختیار کیا، جس فن سے ہمارے دور کے علما بالعموم نظریں چراتے ہیں۔

فی الوقت میرے پیش نظر موصوف کے مضامین کا مجموعہ ''تحقیق و تفہیم'' ہے، جس میں ۲۰۰۳ء سے لے کر ۲۰۰۹ء تک کے اہم مضامین شامل ہیں، جو جام نور کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔ ان میں صرف تین مضامین ایسے ہیں جو جام نور کے صفحات پر شائع نہیں ہوئے۔ ان میں ایک نیو ایج ویژن، ایک اہل سنت کی آواز (مارہرہ) اور ایک تصوف ملی کولکاتا میں شائع ہوئے ہیں۔ حالیہ طریقوں کے برعکس اس مجموعے میں تقریظ، تقدیم، تعارف کے نام پر کسی دوسرے کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ مصنف نے مختصراً پیش گفتار کے نام سے مضامین کا تعارف کرایا ہے، وہ بھی اس انکساری کے ساتھ کہ ''یہ مضامین بغیر کسی بلند بانگ دعوے کے اہل علم کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ تنقید و تنقیح اور اصلاح و استدراک کے دروازے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں، غلطی تسلیم کرنا جرأت کی بات ہے اور الحمدللہ میں یہ جرأت رکھتا ہوں''۔ فی زمانہ یہ بڑی بات ہے کہ ایک مصنف اس بات کا اظہار کر رہا ہے کہ اس کے اندر غلطی تسلیم کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بصورت دیگر آج کے مصنفین یہ گمان کرتے ہیں کہ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' اور اگر کسی کی شامت آئی تو وہ ان کی تحریر پر تنقید کر کے خود کو بھنور میں پھنسا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ بظاہر تو وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ میرے اندر تنقید برداشت کرنے کا مادہ ہے، مگر وقت آنے پر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور دوبارہ تنقید کرنے والوں تک اپنی کتاب و مضامین کی رسائی نہیں ہونے دیتے۔

اس مجموعے میں شامل ۲۷ر مضامین پانچ ابواب پر مشتمل ہیں: پہلا باب تحقیقات کے نام سے ہے جس میں پہلا مضمون ''نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی آخری آیت'' ہے، بعد میں ''خدا کی طرف واپسی''، ''عصر حاضر میں مطالعہ سیرت کی معنویت، اہمیت اور جہت''، ''تحفظ توحید کے نام پر کتب اسلاف میں تحریف''، ''مطبع اہل سنت و جماعت: تاریخی پس منظر اور اشاعتی خدمات''، ''کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون: ایک تحقیقی مطالعہ''، ''عربی اور اُردو محاورات کا تقابلی جائزہ''، ''ہم نامی کا مغالطہ'' مضامین ہیں۔ مختلف موضوعات پر مضامین کافی غور و خوض اور مشاہدات و تجربات کے بعد ٹھہر ٹھہر کر لکھے گئے ہیں۔ تحقیقی [ص:۵۷] اسلوب بھی نہایت دلچسپ ہے۔ ایک ایک نکتے کے لیے قدیم و ضخیم کتابوں کے مطالعے سے جی نہیں چرایا گیا ہے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ موضوع پر مصنف پوری طرح غالب ہیں۔ اس باب میں ''خدا کی طرف واپسی'' اور ''عصر حاضر

میں مطالعہ سیرت کی معنویت، اہمیت اور جہت'' خاص طور پر دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔ خدا کی طرف واپسی کا یہ اقتباس کس قدر دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی پر انگیز کرتا ہے، ملاحظہ کریں:

> دنیا میں پیتل کو سونا کہہ کر بیچنے والوں کی کمی نہیں۔ مغرب میں سوامی رجنیش اوران جیسے دوسرے 'روحانی رہنما' بڑی آسانی کے ساتھ انسان کو حقیقی روحانی سکون کا خواب دکھا کر متأثر کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں، اس قسم کے روحانی رہنماؤں کی صحبت سے انسان کو حقیقی سکون ملا یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے، مگر مغرب میں ان لوگوں کی مقبولیت اوران کی طرف لوگوں کے میلان کو اس بات کی دلیل تو بنایا ہی جاسکتا ہے کہ انسان واقعی حقیقی سکون واطمینان کا کس قدر پیاسا ہے۔

تفہیم حدیث کے تحت پانچ مضامین ''تشہد کے سلسلے میں ایک مغالطے کا تحقیقی جائزہ''، ''کیا رسول اللہ ﷺ امت کے احوال سے باخبر ہیں؟''، ''تبرک بالآثار کے خلاف ایک روایت کا علمی جائزہ''، ''متن حدیث کی بازیافت''، ''حدیث عمامہ پر ایک شبہ اوراس کا ازالہ'' داخل مجموعہ ہیں۔ ان میں بیشتر مضامین ایسے ہیں جن کو لکھتے وقت دل کی بھڑاس نکالی جاسکتی تھی اور مخالف فرقوں کو موضوع بحث بنایا جاسکتا تھا، مگر موصوف نے مناظرانہ اسلوب سے خود کو بچائے رکھا ہے، جس سے مؤثر نتائج برآمد ہوں گے۔ ''تشہد کے سلسلے میں ایک مغالطے کا تحقیقی جائزہ'' میں دلائل کے انبار سے انہیں دلائل کو منتخب کیا گیا ہے جن سے حیات رسول، یا ندا کے ساتھ خطاب، اس پر جمہور صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کا اتفاق ثابت ہوسکے۔ اگر اسی معروضی اسلوب سے ماضی قریب میں بھی کام لیا جاتا تو گرچہ مخالفین راہِ راست پر نہ آتے کم از کم ان اعمال کے خلاف مخالفت کا بازار گرم بھی نہیں کرتے، جس قدر وہ آج متشدد ہو گئے ہیں۔ تفہیم حدیث کا پانچواں اور آخری مضمون ''حدیث عمامہ پر ایک شبہ اوراس کا ازالہ'' ہے جو دراصل فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے حدیث عمامہ کے ترجمے پر اعتراض کا جواب ہے۔ اس میں مولانا جذباتی ہوئے ہیں نہ ہی کسی کے حق میں لاف وگزاف کے مرتکب۔ عامیانہ، جاہلانہ اور کٹ حجتی اسلوب سے ہٹ کر صورت مسئلہ پر اپنے ذہن و دماغ اور تحقیق کو مرکوز کیا ہے۔ کمال ضبط وتحمل یہ ہے کہ معترض کا نام بھی افشا نہیں کیا ہے، وہ داد تحقیق دی ہے کہ اس کے بعد اعتراض باقی رہ ہی نہیں سکتا۔ لغات و کتب کے حوالہ جات، سیاق وسباق اور

صلات کی تطبیق کا اسلوب نہایت عمدہ اور جدید انداز تحقیق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگر چہ، مگر چہ اور چوں کہ کے ساتھ قوم کے دل و دماغ پر ۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو زبان میں فتویٰ داغنے والوں اور بھر منہ پان کھا کر اشکالات مفروضہ کی گتھیاں سلجھانے والے موجودہ درس نظامی کے اساتذہ کے اسلوب سے مولانا کا طرزِ نگارش جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ ایک بدایونی کی جانب سے یہ اچھی پیش کش ہے۔ علم کسی کی جاگیر نہیں ہوتی، یہ اصول ماضی کے کسی علمی خانوادہ پر آج چسپاں ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر آج بھی خانقاہ قادریہ بدایوں پر چسپاں نہیں ہوتا۔

اجتہاد و تقلید کے باب میں پانچ مضامین ''فقہ حنفی اور عمل بالحدیث''، ''ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام''، ''مصنف ابن ابی شیبہ اور فقہ حنفی''، ''علامہ یوسف قرضاوی اور جماعت سلفیہ''، ''رفع یدین کے مسئلے پر ایک دلچسپ مباحثہ'' شامل کیے گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے متشدد حنفی علما کے اسلوب کے برعکس ان مضامین کا تیور مخاصمانہ نہیں دفاعی اور مبنی بر تحقیق ہے، جس کی بنا پر اس کے اثرات دیر پا ثابت ہوں گے۔ انہیں پڑھ کر بدگمانیوں کے پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے، ان سے بدگمانیاں انشاءاللہ زائل ہوں گی اور غور و فکر کے در وا ہوں گے۔

تصوف و سلوک کے باب میں تین مضامین ''کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟''، ''شیخ بہاءالدین شطاری اور رسالۂ شطاریہ''، ''خانوادہ برکاتیہ اور فیضان چشت'' شامل کیے گئے ہیں۔

تصوف پر تعداد کے اعتبار سے مضامین کم ہیں مگر جو ہیں وہ بلاضرورت نہیں ہیں۔ تمام مضامین قابل تعریف ہیں۔ خانوادۂ برکاتیہ پر سلسلۂ چشتیہ کے فیضان کے حوالے سے عرصے بعد ''اہل سنت کی آواز'' کے لیے ۲۰۰۸ء میں یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ دو تین دہائی سے کرم فرماؤں کے ایک طبقے نے قادریہ کے مقابلے میں چشتیہ کو کسی لائق نہیں چھوڑا ہے۔ ان کے نزدیک سلسلۂ چشتیہ لائق اعتنا ہی نہیں۔ اس کتاب میں شامل یہ مضمون خانوادۂ برکاتیہ پر لشکر ہنگامہ ساز چشتیاں کے فیضان کو ظاہر کرنے میں کامیاب ہے۔ اسی مضمون میں مولانا ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ہند و پاک میں تبلیغ اسلام کی کوششوں کا منصفانہ جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت [ص: ۵۸] کے اعتراف میں کسی منصف مزاج کو باک نہیں ہونا چاہیے کہ اس میں سلسلہ چشت اہل بہشت کے صوفیہ اور چشتی خانقاہوں کی

عظیم الشان اور مخلصانہ خدمات کو بڑا دخل ہے۔

یہ بہت خوبصورت اعتراف ہے مگر مولانا جیسے منصف مزاج سے اس سے زیادہ اور خالص سلسلۂ چشتیہ کی داعیانہ مساعی پر ایک تحقیقی مضمون کی امید تھی، بہر حال فی الوقت ڈاکٹر عین تابش کا ایک شعر دل کی تسلی کے لیے گنگنا لینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

خواب آنکھوں میں سلامت ہیں تو اجڑا ہے کیا　　　ہم ابھی تک ہیں سفر میں ابھی بدلا ہے کیا

جام نور کا ایک مستقل کالم تحریری مباحثہ ہے اس کالم کے لیے لکھے گئے مباحثوں میں سے اس مجموعے میں چھ مباحثے ''کیا عالم عرب کے دینی جامعات میں صرف عربی زبان وادب پر ہی زور دیا جاتا ہے؟''، ''دعوت وتبلیغ کے لیے خانقاہی نظام کتنا مؤثر ہے؟''، ''آج اہل خانقاہ کی نئی نسل تعلیم سے دور کیوں ہے؟''، ''جماعت اہل سنت کا حقیقی تعارف کیا ہے'' اور ''دینی کام کا معنی اور اس کے تقاضے کیا ہیں'' شامل کیے گئے ہیں۔ ان تمام مباحث کا جواب کافی تشفی بخش اور ذہن و دل میں اترنے والا ہے۔ ایک ذیلی سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ

> مسند سجادگی پر بیٹھنے کی بنیاد وراثت ہونا چاہیے یا اہلیت؟ یہ سوال بہت حساس اور نازک ہے، اس کے جواب میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وارث کو ہی اہل بنایا جائے۔

تو عرض ہے کہ جب سے خانقاہوں میں جانشینی وراثت میں ملنی شروع ہوئی تبھی سے خانقاہیں مائل بہ زوال ہونی شروع ہوئیں اور سجادہ نشینوں کی شکل میں خانقاہوں میں تانا شاہ اور مفروضہ حکومت کے بادشاہ پیدا ہونے لگے اور آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ لوگ یہ سوال کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے کہ کیا آج بھی خانقاہوں کی ضرورت باقی ہے؟ اگر خانقاہی نظام سے خانقاہیوں کو ذرا بھی الفت و ہمدردی ہے تو دل پر پتھر رکھ کر وہ وراثتی نظام کا سلسلہ ختم کریں اور اہلیت کی بنیاد پر مسند سجادگی کے لیے افراد کا انتخاب کریں کہ یہ نظام خانقاہوں کی بقا کا ضامن ہے اور اگر مولانا اسید الحق جیسا وارث ہو، جس میں تمام تر اہلیت موجود ہو تو مسند سجادگی ضرور اس کے حوالے کی جائے۔ آج خانقاہوں میں پیدا ہوتے ہی شاہزادہ اہل بھی ہو جاتا ہے اور تمام تر خوبیوں کا مالک بھی۔ اسے پڑھنے پڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی پھر وارث کو اہل بنانے کا تصور کیسا؟

اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں، اسلوب تحقیق بھی بالکل صاف و شفاف ہے۔ ہر ہر بات کو باوزن بنانے کے لیے قدیم کتابوں کا سہارا لیا گیا ہے، جس مسئلے میں تحقیق درکار ہے، اس مسئلے کا پہلے تعارف کرایا گیا ہے۔ پھر فریقین کے رجحانات بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن واحادیث اور فقہ کی کتابوں کے اقتباسات کے ذریعے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنی رائے کے قیام پر اصرار نہیں کیا گیا ہے۔ درمیان میں حدیث وفقہ کی مصطلحات جہاں جہاں آئی ہیں وہاں ان کی تشریح وتعریف بھی کردی گئی ہے۔ اس مسئلے میں اگر اشکال کا خدشہ باقی ہے تو خود ہی سوال قائم کر کے اس کا کافی ووافی جواب دیا ہے۔ جامعہ ازہر یا اس جیسے ادارے درحقیقت مسلکی اعتبار سے چڑیا گھر ہوتے ہیں، جہاں مختلف مسالک ومکاتب فکر کے طلبہ موجود ہوتے ہیں اور ان سے سابقہ اور بحث ومباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ غور وفکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں، انسان منطقی داؤ پیچ سے دور ہوتا ہے اور دامن تحقیق واعتدال میں جا پہنچتا ہے، جہاں اسے علمی سکون میسر ہوتا ہے، وہاں پر وہ شور وغوغا اور الزام تراشیوں کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے حق میں دلائل فراہم کرتا ہے۔ ان مضامین میں خاص طور پر تفہیم حدیث اور اجتہاد وتقلید کے مضامین طلبہ کے درمیانی بحث ومباحثہ کے نتائج معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی قابل تذکرہ ہے کہ اس کبر ونخوت سے معمور اور نمائشی دور میں مولانا اپنے قلم سے ازہری نہیں لکھتے۔ حواشی، مراجع اور مصادر کا خانہ نایاب وکمیاب اور دستیاب کتابوں کے انبار سے پُر ہے۔ اس خانے کا مطالعہ بھی سودمند ہے۔

چونکہ مولانا کی خامہ تلاشی اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے، اس لیے میری گردن زدنی کا امکان نہیں کے برابر ہے۔ تھک ہار کر آخر میں بس انہیں چند باتوں پر اکتفا کروں گا کہ کمپوزنگ کی غلطیاں اپنا وجود رکھتی ہیں، بے شمار مقامات پر متروک رسم الخط کا استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا دلائل کی فراہمی میں محو ہو کر کہیں کہیں الفاظ کا بے جا اور بے محل استعمال کر لیتے ہیں، احتجاج گرچہ حجت کے معنی میں ہے، مگر اردو میں اس کا محل استعمال یہ نہیں ہے۔ فہرست مشمولات میں صفحہ نمبر غلط ڈال دیا گیا ہے۔ سرورق، طباعت، کاغذ، کمپوزنگ اعلیٰ اور معیاری ہیں۔ [ص:۵۹]

(ماہنامہ جام نور دہلی، ستمبر ۲۰۱۰ء، ص ۵۷/۵۹)

☆☆☆

# احادیث قدسیہ

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی

☆

یوں تو حدیث کی تمام اقسام بلند و بالا شان والی ہیں لیکن حدیث کی وہ قسم جس کے راوی صادق ومصدوق محمد عربی ﷺ ہوں اس کی بات ہی کچھ الگ ہے۔ احادیث کے وسیع ذخیرے میں ہمیشہ اسے ایک نمایاں مقام حاصل رہا۔ انہی خصوصیات کی بنا پر بعد کے عہد میں علما و محدثین نے احادیث قدسیہ کے مستقل مجموعے تیار کرنے کا اہتمام کیا۔ عربی زبان میں تو اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن اردو کے حصے میں چند ایک کتابیں ہی آسکیں۔ سیف اللہ المسلول حضرت علامہ فضل رسول قادری بدایونی علیہ الرحمہ کے خانوادے کے روشن چشم و چراغ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کی تازہ ترین تالیف ''احادیث قدسیہ'' اسی کمی کو پوری کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اسی کتاب کے مطالعے سے مَیں ابھی ابھی فارغ ہو رہا ہوں۔

یہ کتاب ۱۸۲ر صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے اصل حصے کے آغاز سے قبل سب سے پہلے عرض مرتب کے عنوان سے مؤلف نے کتاب کی تالیف کا پس منظر، منہج تالیف اور اس کے علاوہ دیگر متعلقہ ضروری باتوں کو تحریر کیا ہے۔ کتاب کی تیاری میں زیر استفادہ کتابوں کا تذکرہ کھلے دل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مؤلف چونکہ ایک عظیم اسلامی یونیورسٹی کے قابل فخر فرد ہیں اس لیے انہوں نے پوری عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے ورنہ عام ہندوستانی علما کے یہاں یہ عالی ظرفی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس کے بعد کتاب کا علمی مقدمہ ہے جس میں حدیث قدسی کی تعریف، متعلقہ شبہات، حدیث قدسی اور قرآن کریم کے مابین فرق، حدیث قدسی کی اقسام، تعداد، اس کے موضوعات اور موضوع احادیث قدسیہ پر جامع اور پر مغز گفتگو کی گئی ہے اور اخیر میں اب تک کے احادیث قدسیہ کے بعض اہم مجموعوں کے اسما ذکر کر کے ان پر مختصر گفتگو بھی کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ کئی قسطوں میں جام نور کے صفحات پر بھی شائع ہو چکا ہے۔

مقدمے کے بعد احادیث قدسیہ اور صفات باری کے عنوان سے مولانا منظر الاسلام ازہری کا مضمون شامل ہے۔ احادیث قدسیہ میں چونکہ بہت سی ایسی صفات وارد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جسمانیت ثابت کرتی ہیں اس لیے اس موضوع پر مضمون شامل اشاعت کر کے قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا پیشگی سد باب کر دیا گیا ہے۔ جسم وجسمانیت ثابت کرنے والی آیات واحادیث سے متعلق اہل علم کے چار نظریات بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا نظریہ تفویض کہ ان کا معنی صرف اللہ کو معلوم ہے، دوسرا نظریہ تاویل کہ ان کا صحیح علم رب تعالیٰ کے پاس ہے لیکن الفاظ وقرائن اگر ساتھ دیں تو ان کا ایسا معنی بیان کیا جائے جو شرعاً اور عقلاً درست ہو، تیسرا نظریہ تشبیہ وتجسیم کہ ان کا لغوی اور حقیقی معنی ہی مراد لیا جائے، چوتھا یہ نظریہ کہ معنی تو ظاہری ہی مراد لیا جائے لیکن کیفیت کو مجہول مانا جائے۔ پہلے دو نظریات درست ہیں، تیسرا نظریہ صراحتاً باطل ہے اور چوتھے نظریے کے متعلق مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

> یہ بھی غور وفکر کے بعد تیسرے کے مشابہ ہے اس لیے اس کے بطلان میں کوئی شک نہیں۔ (ص:۵۲)

آگے چل کر نظریہ تفویض پر مفصل گفتگو کے دوران لکھا ہے کہ

> امام حنبل کی جانب بعض محدثین اور ابن تیمیہ نے چوتھے نظریے کا انتساب کیا ہے جو درست نہیں ہے اور معتدل حنبلی علما نے شدت کے ساتھ اس فکر کا رد کیا ہے، جن میں علامہ ابن جوزی سرفہرست ہیں اور پھر ''دفع شبہ التشبیہ'' کے حوالے سے ان کی ایک عبارت کا خلاصہ بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ (ص:۵۸،۵۹)

بلاشبہ علامہ ابن جوزی اس فکر کے شدید مخالف تھے انہوں نے اپنی منفرد ڈائری ''صید الخاطر'' میں ''سلفیون جہال'' کے زیر عنوان چوتھا نظریہ رکھنے والوں کی خبر لی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان حضرات کو یا تو [ص:۵۷] کھلم کھلا تشبیہ وتجسیم کا قائل ہونا چاہیے یا پھر تفویض کا، کیوں کہ وارد متشابہ صفات باری میں جس معنی کے معلوم ہونے کا وہ اقرار کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے جسمانیت ثابت کرتا ہے، لہٰذا انہیں صاف طور پر تجسیم کا قول کرنا چاہیے اور اگر وہ کہیں کہ معنی معلوم کہاں رہا اور معنی تو معلوم ہے لیکن کیفیت مجہول تو پھر یہ کہوں گا کہ ایسی صورت میں معنی معلوم

پر ایمان کہاں رہا کیوں کہ معنی معلوم کی کیفیت بھی معلوم ہے اور جب معنی معلوم ہی نہیں رہا تو اب انہیں نظریہ تفویض کا اقرار کر لینا چاہیے آگے چل کر علامہ ابن جوزی نے اہل تاویل کا دفاع اور ان حضرات پر کئی معارضے قائم کر کے ان کے نظریے کا بطلان ثابت کیا ہے۔ بہر حال مولانا منظر الاسلام ازہری کی اس تحریر سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ البتہ مولانا کے اس مضمون میں صفحہ ۸۳-۸۴ پر سنن ترمذی سے ایک عربی اقتباس نقل کیا گیا ہے لیکن ترجمہ نہیں کیا گیا ہے جو کہ مضمون نگار کا اپنے عام اسلوب سے انحراف ہے۔

اس مضمون کے بعد اصل کتاب کا آغاز صفحہ ۸۷ سے ہوتا ہے۔ اس حصے میں ۱۳ عناوین کے تحت ۱۰۲/احادیث ذکر کی گئی ہیں۔ تمام احادیث سے قبل ان کے معنی و مفہوم کے لحاظ سے ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ احادیث کا ترجمہ فن کارانہ مہارت اور خوبی سے کیا گیا ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ابوالفیض معینی جو ٹھہرے، ترجمہ تو تمام احادیث کا ہی بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے لیکن بعض جملوں کا ترجمہ مجھے بہت پسند آیا، مثلاً عظمت پروردگار کے عنوان سے مذکور پہلی حدیث کے ایک جملے ''سحّاء اللیل والنھار'' کے ترجمے میں لکھا ہے ''شب و روز نعمتوں کو بہاتا ہے'' (ص: ۹۳) یہ ترجمہ بڑا خوبصورت اور بھرپور لگا، اسی عنوان کے تحت مذکور حدیث نمبر ۳ میں ایک جملہ ہے:

**یا عبادی لو انّ اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم قاموا فی صعید واحد فسألونی فأعطیت کل انسان مسألته مانقص ذلک ممّا عندی الا کما ینقص المخیط اذا أدخل البحر** (ص:۹۴)

اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے اور انسان و جنات سب کسی ایک میدان میں کھڑے ہو کر مانگیں اور میں سب کی حاجت پوری کر دوں تب بھی میرے خزانے میں اتنی کمی بھی نہیں ہو سکتی جتنی سمندر میں سوئی ڈالنے سے ہوتی ہے۔ (ص:۹۵)

اس کا لفظی ترجمہ اگر کیا جاتا تو ترجمے کا آخری حصہ اس طرح ہوتا ''اور مَیں سب کی حاجت پوری کر دوں تب بھی میرے خزانے میں اتنی ہی کمی ہوتی جتنی سمندر میں سوئی ڈالنے سے ہوتی

ہے'' ظاہر ہے سمندر میں سوئی ڈالنے سے سوئی کے ساتھ پانی کا کچھ حصہ تو لگا ہوتا ہی ہے اور اس طرح کچھ نہ کچھ کمی تو ہوتی ہی ہے، لیکن اللہ کے خزانے میں اتنی بھی کمی نہیں ہوتی اور سمندر میں سوئی ڈالنے کی تعبیر صرف تمثیل اور ایک محاورہ ہے۔

ترجمے پر نظر ڈالتے وقت دو جگہوں پر میری نظر رک گئی، عظمت پروردگار کے زیر عنوان حدیث نمبرے میں حدیث کا آخری ٹکڑا ہے: **أين الجبارون، أين المتكبّرون** اس کا ترجمہ اس طرح مذکور ہے: ''جبر کرنے والے اور ظلم کرنے والے کہاں ہیں'' [ص:۹۷] جب کہ ہونا چاہیے تھا'' جبر کرنے والے اور تکبر کرنے والے کہاں ہیں، یہاں کتابت کی غلطی کا بھی امکان ہے کیوں کہ **المتکبّرون** کا لفظ اس حدیث میں دو بار وارد ہوا ہے اور پہلے مقام پر ترجمہ صحیح لکھا ہے، اعمال صالحہ کی فضیلت کے عنوان کے تحت مذکور حدیث نمبر۹ میں حدیث کا آخری حصہ ہے: **کنت أداين الناس فآمر فتياني أن ينظروا المعسر ويتجوزوا عن المؤسر** اس کا ترجمہ اس طرح مذکور ہے:

میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اپنے نوکروں سے کہا کرتا تھا مالداروں کو قرض کی واپسی میں مہلت دیا کرو اور غریبوں سے درگزر کیا کرو۔ (ص:۱۵۸-۱۵۹)

یہاں ترجمہ تو درست ہے لیکن نص حدیث کی طباعت میں تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے ''موسر'' کی جگہ ''معسر'' اور ''معسر'' کی جگہ ''موسر'' چھپ گیا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ حوالے میں بھی باب **فضل انظار المعسر** ہی لکھا ہوا ہے جو میرے خیال سے **معسر** کے بجائے **مؤسر** ہونا چاہیے تھا۔ مؤلف کے ترجمۂ حدیث سے بھی میری تائید ہوتی ہے۔ طباعت کی غلطیوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ انسان خطا کا پتلا ہے اس کا بھرپور ثبوت اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض احادیث پر اعراب لگا دیا گیا ہے اور بعض پر نہیں، اس کی کوئی معقول و نامعقول وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی، جن احادیث پر اعراب لگایا گیا ہے وہاں صحت کا التزام نہیں کیا گیا ہے، صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ [ص:۵۸]

عظمت مصطفیٰ کے عنوان کے تحت مذکور حدیث نمبر۲ اعراب سے مزین ہے لیکن حدیث کے آخری حصے ''**حتى يقيم به الملّة العوجاء**'' میں ''يقيم'' کی میم ''حتیٰ'' کے دخول کے باوجود

مضموم ہی ہےاور پھراس پر معطوف فعل ''یفتح'' کی حا بھی مضموم ہی ہے،اس کےعلاوہ اور بھی مطبعی غلطیاں ہیں، چند نمونے پیش کررہا ہوں کہ آئندہ اشاعت میں ان کی اصلاح ہو جائے۔

صفحہ۶۷ پر یہ عبارت تحریر ہے:**تاج العروس لمرتضی لتأویل ردّ احدالمجتملین الی ما یطابق الظاهر**،میرے خیال میں اس میں **تاج العروس** کا سابقہ بالکل غیر متعلق ہے اور خود بعد والی عبارت پچھلی عبارت کی تکرار ہے،صفحہ۹۷ پر **واشار الی حلقه** کے بجائے **خلقه** خاء سے شائع ہوگیا ہے۔صفحہ۱۰۷ پر **طواغیت** کے بجائے **طواغیث** ثاء سے اور اگلے صفحے پر **مخزول** کے بجائے **محزول** حاء سے چھپا ہے جو غلط ہے۔یوں ہی صفحہ۱۹۶/ پر **سخاب** شائع ہوا ہے جو صاد سے صحیح ہے۔شفاعت کے باب میں تین صفحات پر مشتمل لمبی حدیث میں صفحہ۱۳۶ پر **وانی قد کذبت ثلاث کذبات** کے بعد میرے خیال کے مطابق ایک غیر متعلق عبارت **فذکرهن ابو حیان فی الحدیث** شائع ہوگئی ہے۔صفحہ۱۵۹/ پر **انک لو عدته لوجدتنی عنده** کے بجائے **لو وعدته** چھپا ہے جو صحیح نہیں ہے۔اسی طرح صفحہ۱۷۷/ پر **یقظان** کے بجائے **یقضان** ضاد سے لکھا ہوا ہے جو غلط ہے۔یہ اغلاط کے چند نمونے تھے غلطیاں اور بھی ہیں ان مطبعی اغلاط نے کتاب کے حسن کو داغ دار کر دیا ہے۔اس طرح کی علمی کتابوں میں ان فاش غلطیوں سے علم دوست قاری بددل ہوتا ہے اور مؤلف کے تئیں اس کا غلط تأثر قائم ہوتا ہے جب کہ کمیاں طباعت کی ہوتی ہیں۔

ان کمیوں سے قطع نظر کتاب اپنے مواد مشمولات اور پیش کش کے لحاظ سے عمدہ ہے۔میرے خیال میں اگر کتاب کے آخر میں مصادر ومراجع کی ایک فہرست شامل کردی جاتی تو کتاب علمی طور پر اور باوزن ہوجاتی۔کتاب کا انتساب فرنگی محل اور وہاں کی عظیم شخصیات کی جانب کیا گیا ہے۔کتاب کی قیمت ذکر نہیں کی گئی ہے۔بہر حال احادیث قدسیہ کا یہ مجموعہ احادیث قدسیہ کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ اہل اردو کے لیے بیش قیمت تحفہ،منہج علمی ہونے کے باوجود اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔امید کی جاتی ہے کہ ہر حلقے میں مقبول ہوگی۔[ص:۵۴]

(ماہنامہ جامِ نور دہلی، جون ۲۰۰۹ء،ص:۵۷، ۵۸، ۵۴)

☆☆☆

# احادیث قدسیہ

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

ظفر حسنین

☆

یہ کتاب مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کی تالیف ہے، اس میں انہوں نے مختلف عناوین کے تحت احادیث قدسیہ کو جمع کیا ہے۔ اس کا خاص خیال رکھا ہے کہ اس کتاب میں صرف صحیح اور معتبر احادیث ہی ذکر کی جائیں۔ درج ذیل عناوین قائم کیے ہیں اور ان کے تحت احادیث قدسیہ ذکر کی ہیں۔ عقیدہ و ایمان، عظمت پروردگار، رحمت و مغفرت، جنت و دوزخ، عظمت مصطفیٰ ﷺ، انبیا و مرسلین، شفاعت، امت محمدیہ کی فضیلت، اولیا و صالحین کا مرتبہ، شہدا کا مرتبہ اور جہاد کی فضیلت، اعمال صالحہ کی فضیلت، متفرقات، ان بارہ عناوین کے تحت انہوں نے تمام احادیث قدسیہ کو جمع کیا ہے۔

کتاب میں ذکر کردہ تمام احادیث کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ شروع میں مصنف کا احادیث قدسیہ کے متعلقات پر مبسوط مقدمہ ہے جو ۳۵ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مولانا منظر الاسلام ازہری کا احادیث قدسیہ اور صفات باری کے موضوع پر ایک طویل مضمون ہے جو ۳۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد احادیث قدسیہ ترجمے کے ساتھ پیش کی ہیں۔

کتاب کا کاغذ عمدہ ہے، طباعت بھی اچھی ہے۔ مصنف کی محنت قابل قدر ہے۔ البتہ اس میں دو چیزوں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ صرف ترجمے پر اکتفا کیا گیا ہے جب کہ ترجمے کے ساتھ تشریح کی بھی ضرورت ہے۔ بعض احادیث واقعی تشریح طلب ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ احادیث کو شمار نہیں کیا گیا ہے کہ کتاب میں کتنی حدیثیں ذکر کی ہیں۔ اگر ابتدا سے آخر تک ہر حدیث کے ساتھ نمبر شمار دیتے چلے جاتے تو آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ کل کتنی حدیثیں اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ طباعت میں اس کا خیال رکھا جائے گا۔ [ص:۶۹]

(سہ ماہی المجیب، پٹنہ، جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۹ء، ص:۶۹)

☆☆☆

# قرآنِ کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

مولانا ذیشان احمد مصباحی

☆

بات اس وقت کی ہے جب مَیں الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں زیر تعلیم تھا، استاذ گرامی حضرت علامہ محمد احمد مصباحی کے کمرے میں پہلی بار بدایوں سے شایع ہونے والا ماہانہ مجلّہ ’’مظہر حق‘‘ کا ایک شمارہ زیب نگاہ بنا۔ مدیر مفتی عبدالحکیم نوری تھے، جن کی شخصیت میرے لیے مانوس ومعلوم تھی۔ مَیں نے پرچہ الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک عنوان پر نظر ٹک گئی، مَیں نے جلدی جلدی اس کے مندرجات پر ایک سرسری نظر دوڑائی، مضمون بہت پسند آیا، یہ سلسلہ وار مقالے کی ایک قسط تھی، جی میں آیا کہ کاش میں پورے مقالے کو پڑھ سکتا، لیکن یہ میرے لیے ممکن نہ ہوسکا، اب یہ مقالہ کتابی شکل میں میرے سامنے ہے جس کے مؤلف ہیں میرے بزرگ دوست صاحبزادہ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی، جن سے شناسائی کی پہلی وجہ بھی یہی علمی مقالہ بنا۔ اواخر ۲۰۰۴ء میں مَیں دہلی چلا آیا اور آتے ہی مدیر اعلیٰ جام نور مولانا خوشتر نورانی کی رفاقت میں تحریک جام نور کو آگے بڑھانے میں مصروف ہوگیا، مَیں نورانی صاحب سے بار بار اصرار کرتا رہا کہ آپ مولانا اسید الحق سے کہیں کہ وہ اپنا علمی مقالہ پھر سے جام نور میں شایع کرائیں، موصوف کے کہنے پر بالآخر مولانا اسید الحق نے اپنے مقالے پر نظر ثانی کی اور بعض حذف واضافات کے بعد جام نور کو ارسال کیا، جو اگست ۲۰۰۶ء تا نومبر ۲۰۰۶ء کے شماروں میں قسط وار شایع ہوا۔ جام نور کا جو ہم نے معیار متعین کیا ہے اس کے پیش نظر ہمیں بہت سارے غیر مطبوعہ مضامین بھی شایع کرنے سے معذرت کرنی پڑتی ہے جس کے لیے ہمارے بعض کرم فرما ناراض بھی ہوجاتے ہیں، لیکن یہ مطبوعہ مقالہ تھا جسے نہ صرف ہم نے شایع کیا بلکہ اس کے لیے مقالہ نگار سے گزارش کی اور اصرار کیا۔

کتاب کے ’’پیش لفظ‘‘ میں مؤلف محترم نے جو معلومات فراہم کی ہے اس سے اس مقالے

کی مزید اہمیت ومقبولیت معلوم ہوئی، ''پیش لفظ'' کے مطابق یہ مقالہ موصوف نے از ہر شریف میں دوران طالب علمی عربی زبان میں ''التفسیر العلمی للقرآن دراسة نقدية'' کے عنوان سے لکھا تھا، بعد میں اسے اردو میں منتقل کر کے ۲۰۰۳ء میں ماہنامہ ''مظہر حق'' بدایوں میں قسط وار شایع کرایا، پھر یہی مقالہ سہ ماہی ''بدایوں'' کراچی میں شائع ہوا، حذف واضافات کے بعد ۲۰۰۶ء میں جام نور نے شایع کیا اور جام نور سے ہی ماہنامہ ''سوئے حجاز'' لاہور نے مارچ ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں شامل کیا۔ اب یہ مقالہ کتابی شکل میں آ گیا۔ ہمیں امید ہے کہ اب بھی اسے دوسرے رسائل شایع کریں گے اور اہل علم حوالے میں اس کا ذکر کریں گے۔

کتاب ضخامت کے لحاظ سے وزنی نہ سہی لیکن علمیت اور ثقاہت کے لحاظ سے ضرور باوزن ہے۔ موضوع کے جتنے ضروری گوشے ہو سکتے تھے مقالہ نگار نے سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ تمہید کے بعد سائنسی تفسیر کا مفہوم بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد سائنسی تفسیر کے حوالے سے متقدمین و متأخرین ومعاصرین کی آرا نقل کی گئی ہیں، متقدمین میں امام غزالی، امام رازی اور امام سیوطی کی آرا شامل کی گئی ہیں، جب کہ متأخرین ومعاصرین کو دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک خانہ ہے حامی گروپ کا جب کہ دوسرا مخالف گروپ کا۔ سائنسی تفسیر کے حامیوں میں علامہ شیخ طنطاوی الجوہری، علامہ عبدالرحمٰن الکواکبی، علامہ طاہر بن عاشور، ڈاکٹر حنفی احمد، ڈاکٹر جمعہ علی عبدالقادر اور امام متولی الشعراوی کی آرا کو جگہ دی گئی ہے، جب کہ مخالفین میں سے امام ابواسحاق شاطبی، شیخ محمد شلتوت اور علامہ عبدالعظیم الزرقانی کی آرا شامل ہیں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے ۳رصفحات میں موافقین ومخالفین کی آرا کا ''تنقیدی جائزہ'' لیا ہے، جس کا مقصد موافقین ومخالفین کی بعض آرا کو رد کرنا اور بعض کو قبول کرنا ہے، جو معروضی تحقیق کی شان ہے، اس ذیل میں انہوں نے بطور خلاصہ ۵رنکات بیان کیے ہیں جن کا حاصل یہ ہے:

(۱) قرآن کے سائنسی اعجاز کو خارج از امکان بتانا ایسے ہی غلط ہے جیسے اس کے مظاہر اعجاز کو صرف سائنسی اعجاز میں منحصر ماننا۔

(۲) ایک نص قرآنی مختلف معانی کی محتمل ہو سکتی ہے، لیکن ان معانی میں اختلافِ تنوع ہونا چاہیے نہ کہ اختلافِ تضاد۔

(۳) یہ صحیح ہے کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، سائنس یا ہندسہ کی کتاب نہیں، لیکن اگر کوئی حقیقت علمیہ اور نظریۂ کونیہ بلا تکلف و تحکم کسی [ص:۵۹] آیت پر منطبق ہو تو اس سے منہ موڑ لینے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۴) قرآن اس سے بے نیاز ہے کہ اس کی صداقت وصحت پر علوم جدیدہ سے سند اور دلیل لائی جائے، البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مدد لی جا سکتی ہے۔

(۵) سائنسی تفسیر کے مخالفین کہتے ہیں کہ سائنسی نظریات و تحقیقات کے اندر خود ہی ثبات نہیں ہے، ایسے میں قرآن و سائنس میں مطابقت کی تلاش قرآن کو کتاب تضاد بنا کر پیش کرنا ہے، ڈاکٹر جمال مصطفیٰ پروفیسر شعبۂ تفسیر جامعہ از ہر جواب میں کہتے ہیں کہ

> اگر کسی حقیقت علمیہ ثابتہ کی نظیر کسی آیت کے محتمل معانی میں سے کسی ایک میں پائی جائے تو اس احتمال کو تسلیم کیا جائے گا، مگر اس پر جزم وقطعیت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، اب اگر کسی زمانے میں بالفرض اس نظریے کے خلاف دلیل قائم ہو جائے تو بھی قرآن پر کوئی حرف نہیں آئے گا کیوں کہ ہم نے اس حقیقتِ علمیہ پر نص قطعی کا دعویٰ نہیں کیا تھا''۔ پروفیسر صاحب کا جواب بظاہر معقول ہے مگر 'فیہ ما فیہ' (ص:۴۰)

ان نکات پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے واضح ہو کر آتی ہے وہ یہ کہ مولانا اسید الحق قادری بھی سائنسی تفسیر کے حامیوں میں سے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے لیے تکلف و تحکم اور کھینچ تان کے قائل نہیں، سائنسی تفسیر لکھتے وقت ان کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسی نئی بات نہ کہہ دی جائے جو کسی پرانی تفسیر، جوامت کا عقیدہ یا معمول ہو، کے خلاف ہو، یا وہ ایسی بات ہو جس کا رد قرآن کی کوئی دوسری آیت کر رہی ہو، بڑے ادب کے ساتھ یہاں میں چوتھے نکتے کے پہلے حصے کے بارے میں یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یہ سائنسی تفسیر کے مخالفین کا ''خطیبانہ جملہ'' ہے، اور خطیبانہ جملے صرف کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اگر اس طرح کے جملوں سے سائنسی تفسیر کا رد کرنا ممکن ہو تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ''قرآن

اس سے بے نیاز ہے کہ اس کی صداقت وصحت پر علوم بلاغت سے صحت وسند لائی جائے'' اور یہ کہہ کر وہ قرآن کی ماضی میں لکھی گئی بلاغی تفسیروں کو رد کر سکتا ہے، جن کا کردار اعجاز قرآن کے اظہار میں بہت نمایاں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن سائنسی تفسیر کا محتاج ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ آیا مسلم علما کو اس بات کی ضرورت ہے یا نہیں کہ وہ سائنسی تفسیر کریں تاکہ دین اور قرآن کے تعلق سے مشکوک ذہنوں کے شبہات کا ازالہ ہو اور انہیں یقین یا حق الیقین کی دولت ملے؟

عالی مرتبت مولانا اسید الحق نے مخالفین کی اس بات کو ''درست'' قرار دیا ہے، اس کے بعد خود ہی یہ سوال قائم کیا ہے کہ ''اگر سائنسی تفسیر نہ کی جائے تو آخر ''خوگر پیکر محسوس'' اور دلیل ومشاہدہ کے عادی عقلیت پسند اور مادہ پرست انسان کو کیوں کر قرآن کی صداقت کا قائل کیا جا سکتا ہے؟'' پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ یورپ وامریکہ میں جن لوگوں نے گذشتہ برسوں میں اسلام قبول کیا ہے ان میں ایک تعداد ان کی بھی ہے جو سائنسی تفاسیر سے متأثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہوئے، لیکن اکثریت ان کی ہے جو اسلامی تعلیمات سے متأثر ہو کر دامن اسلام سے وابستہ ہوئے۔ موصوف نے اپنی اس بات کی تائید میں ڈاکٹر احمد المرسی کی کتاب ''**لماذا أنا مسلم؟**'' کا حوالہ دیا ہے جس میں ۱۰۰ غیر مسلموں کی داستان ایمان افروز ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ

> ان میں صرف ۱۹/لوگ ایسے ہیں جو قرآن اور سائنس کی حیرت انگیز تطبیق دیکھ کر متأثر ہوئے، باقی سب لوگوں کو قرآن کی انھیں تعلیمات نے متاثر کیا ہے جن کا ہم نے ماقبل میں ذکر کیا ہے (ص:۳۸)

خیال رہے کہ موصوف یہ بات سائنسی تفسیر کے مخالفین کی تائید اور سائنسی تفسیر کی عدم ضرورت کے اثبات میں لکھ رہے ہیں، لیکن کوئی غور کر کے بتائے کہ اس بات سے سائنسی تفسیر کی عدم ضرورت ثابت ہو رہی ہے یا ضرورت؟ موصوف کی بات مان لینے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آج اسلام کی ۱۹/ فیصد تبلیغ صرف سائنسی تفسیر کی رہین منت ہے (مسلم اور غیر مسلم ذہنوں کے دین کے تعلق سے شبہات کا ازالہ الگ) کیا اس سے سائنسی تفسیر کی شدید ضرورت ثابت نہیں ہوتی؟

موصوف نے پانچویں نکتے کے ذیل میں پہلے مخالفین کا ایک اعتراض نقل کیا جسے ''نہایت برجستہ اور منطقی'' بتایا(ص:۳۹) جس کے جواب میں اپنے استاذ ڈاکٹر جمال مصطفیٰ کا اقتباس پورے ایک صفحے میں نقل کیا جو مجھے ''نہایت برجستہ اور منطقی'' معلوم ہوا (اس میں میرے فہم کا قصور بھی ہوسکتا ہے) پھر اس کو ''بظاہر معقول مگر فیہ مافیہ'' (ص:۴۰) کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ اب یہ کم علم یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہے کہ یہ نکتہ نہ رہا ''معمہ'' بن گیا۔ نیز اس ''فیہ مافیہ'' کو اگر اجاگر کر دیا گیا ہوتا تو مجھ جیسے کم علموں کی رہنمائی ہو جاتی، پھر یہ سوال بھی مولانا اسید الحق پر قرض رہتا ہے کہ اگر وہ سائنسی تفسیر کے حامیوں میں ہیں تو مخالفین کے اس اعتراض کا معقول اور صحیح جواب کیا ہے جو ''فیہ مافیہ'' کے نقص سے بری ہے؟[ص:۶۰]

سائنسی تفسیر کے موافقین و مخالفین کی آرا کا تجزیہ و محاکمے کے بعد موصوف نے ''قرآن اور سائنس میں تعارض کی حقیقت''، ''سائنسی تفسیر میں بعض بے اعتدالیاں''، ''سائنسی تفسیر کے رواج کے اسباب'' اور ''سائنسی تفسیر کے جواز کے لیے کچھ شرائط'' نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ رقم کیے ہیں، یہ ساری باتیں صرف ۶ رصفحات میں سما گئی ہیں اور خاص بات یہ کہ کوئی ضروری گوشہ تشنہ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد ''غیر مقبول سائنسی تفسیر کی کچھ مثالیں'' دی ہیں۔ اس ذیل میں تین مثالیں ہیں: پہلی آیت کریمہ ''و یقذفون بالغیب من مکان بعید'' (السبا:۵۳) کی تفسیر ٹیلی فون، ٹیلی گراف، ٹی وی اور ریڈیو وغیرہ سے، دوسری مثال ہے: دابة الأرض (النمل:۸۲) کی تفسیر سیٹیلائٹ سے اور تیسری مثال ہے: سبع سموات کی تفسیر سات سیاروں یا مختلف قسم کی گیسوں کی سات تہوں وغیرہ سے۔ فاضل اجل مولانا اسید الحق قادری نے نہایت عالمانہ انداز و اسلوب اور دلائل و براہین سے ان تفاسیر کو رد کیا ہے اور ان کے اندر جدید مفسرین نے جو کھینچ تان کی ہے اسے اجاگر کیا ہے۔

کتاب کے مندرجات میں ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے، وہ یہ کہ جس طرح غیر مقبول سائنسی تفاسیر کی مثالیں دی گئی ہیں مقبول سائنسی تفاسیر کی کچھ مثالیں بھی دی جانی چاہیے تھیں، اس کمی کا احساس مؤلف موصوف کو بھی ہے جس کا اظہار انہوں نے ''پیش لفظ'' (ص:۷) میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک مستقل مقالہ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس کا ہمیں شدت سے انتظار ہے۔

کتاب اپنے موضوع پر مکمل ہونے کے ساتھ کئی دوسری جہتوں سے بھی اہم ہے، علمی مباحث کو عام فہم اسلوب میں پیش کرنے کی مثالیں آج کل کم ملتی ہیں، یہ ان میں ایک اچھی مثال ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے، اس سلسلے میں مولانا اسید الحق کا ہمزاد ابوالفیض معینی برصغیر میں ہلچل مچا چکا ہے، صرف ایک لفظ ''سنہ ثالثہ'' ایسا تھا جس پر نظر رکی، خیال آیا کہ ممکن ہے کہ مولانا اسید الحق ازہری نے ''پیش لفظ'' آخر آخر میں لکھا ہو اور اتنی فرصت نہ ملی ہو کہ وہ ابوالفیض معینی حیدرآبادی کو بغرض اصلاح دکھلا سکتے، خیر یہ بھی ضروری تھا تا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اسید الحق صرف بدایونی نہیں ازہری بھی ہیں۔[ص:۴۹]

(ماہنامہ جامِ نور دہلی، اپریل ۲۰۰۸ء، ص:۵۹، ۶۰، ۴۹)

☆☆☆

# قرآنِ کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

محمد ریاض کرمانی

☆

قرآن کریم کی سائنسی تفسیر کا رجحان عربی میں غالباً شیخ محمد عبدہ اور اُردو میں سر سید احمد سے شروع ہوتا ہے۔ اس رجحان کا پیدا ہونا بعید از عقل بھی نہیں ہے، کیوں کہ قرآن ایک ہمہ گیر اور عالم گیر کتاب ہے۔ اس کو جس علمی سطح کا شخص بھی پڑھے گا اس سے مطمئن ہو گا اور اسی سطح سے اس کتاب میں معنیٰ آفرینی کرے گا۔ لیکن اس راہ میں افراط و تفریط کے قوی امکانات ہیں، جس کا شکار تقریباً سبھی سائنسی مفسرین نظر آتے ہیں۔ مرعوبیت، غلط تفہیم اور غیر درست تطبیق کے ساتھ عمدہ، چشم کشا اور حیرت انگیز نمونے بھی ملتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مفسرینِ قرآن کو دو طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے: اول قدامت پسند، دوم جدت پسند۔ پھر جدت پسندوں کے چار طبقات کیے گئے ہیں: [ص:۴۶۶] (۱) مرعوب، (۲) قرآن میں خاصا درک رکھنے والے، مگر عصری علوم میں زیادہ گہری نظر نہیں (۳) عصری علوم میں زیادہ گہری نظر رکھنے والے (۴) جن کو نہ علوم قرآن میں کوئی خاص درک ہے نہ عصری علوم سے کوئی واسطہ۔ مؤلف نے اپنے تمہیدی کلمات میں اس تقسیم کے بعد ایک عنوان ''سائنسی تفسیر کا مفہوم'' قائم کیا ہے۔ اس کے تحت انہوں نے اپنے ازہری استاذ ڈاکٹر جمال مصطفیٰ النجار کے الفاظ میں سائنسی تفسیر کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

> قرآن کی وہ آیات جو انفس و آفاق کے بارے میں وارد ہیں ان کا بیان اور
> جدید سائنسی ایجادات اور تحقیقات کے ذریعے ان کی شرح

اس کے بعد سائنسی تفسیر کے حق میں امام غزالی، امام فخر الدین رازی اور امام جلال الدین سیوطی کی وہ دلیلیں ذکر کی ہیں جو سائنسی مفسرین اکثر پیش کرتے ہیں۔

ایک عنوان ''متاخرین و معاصرین کی آرا'' کے تحت سائنسی تفسیر کے موجودہ حامیوں کو دو

طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک متشددین، دوسرے اعتدال پسند، متشددین اس طریقۂ تفسیر کو فرضِ عین قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی شرط قبول نہیں کرتے اور مخالفین کو قدامت پرست، کوتاہ نظر، جاہل اور احمق کہتے ہیں۔ اعتدال پسند اس طریقِ تفسیر کے حامی ضرور ہیں مگر وہ کچھ شرائط اور حدود مقرر کرتے ہیں۔ مصنف نے غالی اور متشدد طبقے میں سے علامہ شیخ طنطاوی جوہری، علامہ عبدالرحمٰن کواکبی، علامہ طاہر بن عاشور، ڈاکٹر حنفی احمد اور ڈاکٹر جمعہ علی عبدالقادر اور اعتدال پسندوں میں سے صرف شیخ متولی شعراوی کے دلائل ذکر کیے ہیں۔

مخالفین میں امام ابواسحاق شاطبی، شیخ محمود شلتوت، علامہ عبدالعظیم الزرقانی، عباس محمود العقاد اور علامہ محمد حسین الذہبی کے دلائل کا تعارف کرانے کے بعد موافقین اور مخالفین کی آرا کا تنقیدی جائزہ پانچ نکات میں پیش کیا گیا ہے۔ ان نکات کا لب لباب یہ ہے کہ سائنسی تفسیر مشروط طور پر جائز ہے، مگر اس کے لیے دونوں قسم کے علوم میں مہارت ضروری ہے، تاکہ افراط و تفریط سے بچا جا سکے اور مفسر مرعوبیت کا شکار نہ ہو۔ اگر قرآن [ص:۴۶۷] اور سائنس میں تعارض ہو تو مصنف کا عقیدہ ابن رشد کی طرح یہ ہے کہ یا تو سائنس میں کہیں غلطی ہے یا قرآن کی تفہیم میں کچھ کمزوری ہے۔ انہوں نے سائنسی تفاسیر میں تین بڑی بے اعتدالیوں کی نشاندہی کی ہے: (۱) سائنس کے ہر نظریے کو قرآن کے مطابق ثابت کر دکھانے کی جد و جہد (۲) قرآن اور سائنس کے درمیان تطبیق کی خاطر قرآن کے سیاق و سباق، شانِ نزول حتی کہ عربی قواعد سے بھی صرف نظر (۳) یہ تاثر دینا کہ نزولِ قرآن کے زمانے سے آج تک فلاں آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھا گیا اور اب سائنس نے اس کی وضاحت کی ہے۔ اُن کے نزدیک سائنسی تفسیر کا رواج چار وجوہ سے ہو رہا ہے: (۱) جدید ذہن کو اس طریقِ تفسیر سے متاثر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ (۲) یہ اعتقاد کہ قرآن میں اول و آخر تمام علوم جمع کر دیے گئے ہیں۔ (۳) سائنس سے مرعوبیت اور اس کو حق و ناحق کا معیار سمجھ لینا۔ (۴) مسلمانوں کا اپنے زوال اور مغرب کی ترقی کی وجہ سے احساسِ کم تری میں مبتلا ہو جانا۔

مؤلف نے سائنسی تفسیر کے جواز کے لیے چھ شرائط بیان کی ہیں: (۱) بغیر واضح اور قطعی قرینے کے نص کو حقیقی معنیٰ سے مجاز کی طرف پھیرنا جائز نہیں۔ (۲) موضوع سے متعلق تمام

آیات قرآنی کو جمع کر کے ایک معنیٰ متعین کرنا ضروری ہے۔(۳) جب تک کوئی سائنسی تحقیق 'سائنسی حقیقت' کے درجے کو نہ پہنچ جائے، سائنسی تفسیر جائز نہیں۔(۴) نزولِ قرآن کے زمانے میں الفاظِ قرآن کے جو مدلولات تھے ان سے تجاوز کر کے وہ معنی اختیار نہ کیے جائیں جن میں آج وہ الفاظ مستعمل ہیں۔ مثلاً لفظ 'ساعت' کو آج کے معنی کے مطابق گھڑی کے مفہوم میں نہ لیا جائے۔(۵) صرفی قواعد اور اصولِ بلاغت سے خروج نہ کیا جائے۔(۶) تطبیق کے وقت آیت کے سیاق و سباق اور شانِ نزول کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے سائنس اور قرآن کے درمیان تطبیق کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ عموماً سائنسی تفسیر کرنے والے ان شرائط کا لحاظ نہیں رکھ پاتے، اسی لیے مضحکہ خیز تفاسیر سامنے آ رہی ہیں۔ چنانچہ قرآنی آیت وَيُقْذَفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ (سبا:۵۳) سے ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ٹی [ص:۴۶۸] .وی وغیرہ کی طرف اشارہ، دَآبَّةً الارض (النمل:۸۲) سے سیٹیلا ئٹ یا سات آسمانوں سے سات سیارے مراد لینا، یا جدید ترین معلومات کی روشنی میں زمین کے اوپر نظام شمسی کو پہلا آسمان، ہماری کہکشاں کو دوسرا، اور اسی طرح مشہور آسمان کو مزید پانچ حصوں میں تقسیم کرنا، یہ سب مصنف کے نزدیک غلط تطبیقات ہیں۔ آخر میں ان کا کہنا ہے کہ

> تفہیم قرآن میں سائنسی علوم کو اس طرح استعمال کیا جانا چاہیے کہ یہ علوم قرآن کے خادم نظر آئیں، نہ کہ ان کو قرآن پر حاکم بنا دیا جائے۔

فاضل مصنف نے مباحث مع دلائل مبسوط انداز میں پیش کیے ہیں۔ البتہ ایک کمی ضرور ہے، جس کا احساس خود انہیں بھی ہے وہ یہ کہ مقبول سائنسی تشریحات کے نمونے کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ اگر تھوڑی اور محنت کر کے یہ نمونے بھی جمع کر دیے جاتے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ ممکن ہے کہ یہ نمونے اُن تفاسیر میں ہی مل جائیں جن سے غیر مقبول نمونے جمع کیے گئے ہیں۔ بہر حال کتاب بہت خوب اور تمام علما اور دانشورانِ ملت کے لیے سود مند ہے۔[ص:۴۶۹]

(تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۸ء، ص:۴۶۸، ۴۶۹ )

☆☆☆

# حدیث افتراق امت: تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں

مولانا اسید الحق قادری بدایونی

مولانا ذیشان احمد مصباحی

☆

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ بہت ہی دلچسپ موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور اگر موضوع خشک بھی ہو تو وہ اپنے زرنگار قلم، ادبی و علمی اسلوب اور تخلیقی ذہن سے اس میں دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ مولانا جامِ نور میں جب سے لکھ رہے ہیں ان کو جامِ نور سے اور جامِ نور کو ان سے ایک منفرد پہچان ملی ہے۔ ان کی اب تک کی تمام تحریریں پوری دلچسپی اور توجہ سے پڑھی گئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے بعض کرم فرما ان کی تحریروں کو دلچسپی سے کم اور توجہ سے زیادہ پڑھتے ہیں۔ ان کا علمی و تحقیقی مقالہ ''حدیث افتراقِ امت: تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں'' جب جامِ نور (مئی تا اگست ۲۰۰۵ء) میں قسط وار شائع ہوا تو توجہ اور تشکیک سے پڑھنے والے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ شکوک تو اس گنہ گار تبصرہ نگار کو بھی ہوئے، مگر جوں جوں تحریر اپنے اختتام کو پہنچی تقریباً سب کا ازالہ ہو گیا۔ اسی طرح جامِ نور کے نقد نگار ابوالفیض معینی صاحب کو بھی اس پر اہل علم کی جانب سے کچھ کھٹے میٹھے ردعمل کی توقع تھی۔ ان کا اندیشہ غلط بھی نہیں تھا کیوں کہ جام نور کے ہی معروف قلم کار مولانا ملک الظفر سہسرامی بنفس نفیس اپنے معروضات یا معارضات لکھنے والے تھے۔ انہی کی سرزمین سہسرام کے ایک فاضل جنھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی ہے اور بقول راوی مجہول آغاز بھی نہیں کیا ہے، بہار شریعت کے حوالے سے مولانا اسید الحق کے مقالے کا دندان شکن جواب بھی دیا (اگر واقعی مولانا کے مقالے میں دندان تھے تو) جو ابھی تک تشنۂ طباعت ہے۔ سنا ہے درس نظامیہ کے ماہرین اس تنقیدی کلامی جوابی تحریر کو ''شرح عقائد'' کے بعد داخل درس نظامیہ کرنے پر غور کر رہے ہیں۔

المختصر! مولانا کی تحریر چھپی، کسی علمی حلقے سے، زبانی یا ذہنی تشویش کے علاوہ، کوئی ردعمل

نہیں آیا۔ وقت گزرتا رہا، مولانا کو اس مقالے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ہوا، لیکن اشاعت سے قبل اپنی تحریر کو ہندوستان کے چند مستند علما تک انہوں نے اپنا پورا مقالہ بغرض نظر ثانی واصلاح بھیجا، جب کہیں سے کوئی اصلاح، ردعمل، اختلاف یا توثیق نہیں آئی تو بالآخر خود پوری سنجیدگی اور کشادہ قلبی کے ساتھ مقالے پر نظر ثانی کی اور اس موضوع پر مزید مطالعہ کیا، جتنا مطالعہ کرتے گئے، اپنے اختیار کردہ موقف پر اطمینان میں اضافہ ہوتا گیا، بعض نئے حوالوں اور مباحث کا اضافہ کیا، جن مقامات پر غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی، ان کو اور واضح کیا اور کامل اطمینان کے بعد نومبر ۲۰۰۸ء میں کتاب کو پریس کے حوالے کر دیا۔ وہ بھی اس وسعت ظرفی کے ساتھ کہ

> مجھے نہ ہمہ دانی کا زعم ہے اور نہ ہی دعویٔ عصمت، علوم اسلامیہ کا ایک معمولی طالب علم ہوں، جس سے ہر قسم کی غلطی کا صد فی صد امکان ہے، لہٰذا اگر کوئی سنجیدہ اور علمی تنقید سامنے آتی ہے تو مجھے مقالہ پر نظر ثانی کرنے اور غلطی واضح ہونے کی صورت میں اپنی خطا کے اعتراف اور قبول حق میں کوئی تأمل نہیں ہوگا۔ (ص:۷، حرف آغاز)

مذکورہ کتاب اس وقت میرے تبصرے کی میز پر ہے۔ مَیں نے اسے توجہ سے دوبارہ پڑھا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر اس کتاب میں وہ کون سی بات ہے جس کو لے کر ہمارے یہاں تشویش کا ماحول ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ دل میں یہ خطرہ گزرا کہ حدیث افتراق امت کی تشریح میں مولانا کا اختیار کردہ موقف ضرور کسی نہ کسی جہت سے کمزور ہوگا جبھی تو پہلے اس کے حوالے سے تشویش ہوئی اور اب خاموشی ہے، نہ تائید نہ مخالفت۔ لیکن پھر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ مولانا نے تو کوئی نئی بات کہی ہی نہیں ہے، مولانا کے ساتھ تو تمام متقدمین ومتاخرین علما ہیں۔ عبداللہ ابن مبارک، ابوالحسن اشعری، ابوالمظفر الاسفرائنی، امام بیہقی، امام غزالی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مجدد الف ثانی، محقق دوانی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی، شاہ انوار اللہ فاروقی وغیرہ وہ علما ہیں جن کو مولانا نے اپنی تائید میں کھڑا کر دیا ہے اور تو اور عصر حاضر

کے جید عالم دین شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں کچھوچھوی کا موقف بھی وہی ہے جو مولانا نے اختیار کیا ہے۔

واضح رہے کہ حدیث افتراق امت کے تعلق سے مولانا کا[ص:۵۹] موقف ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> اس حدیث میں امت سے بعض حضرات نے امت دعوت مراد لیا ہے مگر یہاں امت اجابت زیادہ صحیح ہے۔حدیث کے الفاظ میں ''**کلها فی النار** '' سے''**خلود فی النار** ''نہیں بلکہ صرف''**دخول فی النار** '' مراد ہے۔فرقۂ ناجیہ کے علاوہ باقی فرقے گمراہ اور گمراہ گر ہوں گے،ان کے شر سے عوام کو متنبہ کرنے کے لیے ان کا رد وابطال کیا جانا ضروری ہے۔(ص:۷۶)

عوام وخواص کی تشویش کے حوالے سے کافی غور وخوض کرنے کے بعد مَیں اس کی ایک وجہ تلاش کر لینے میں کامیاب ہو گیا،جس کا تعلق اس کتاب سے نہیں ہندوستان کے موجودہ ماحول سے ہے،جس میں ہر داعی صلح کلی، ہر حکیم ودانا منافق، ہر دانشور مشکوک اور ہر فقیہ اسلاف مخالف نظر آتا ہے، جہاں تشدد کا نام تصلب ، جہالت کا نام خوش عقیدگی ، اعتدال کا نام صلح کلیت اور حکمت کا نام منافقت پڑ گیا ہے،جس کی وجہ سے انجینئر بلڈنگ کا نقشہ بنانے کی بجائے فقیہ و محدث کے ایمان کی پیمائش کر رہا ہے،فقیہ رائے دیتے وقت جاہلوں کے جم غفیر سے ڈرتا ہے، پیر اپنا موقف مریدوں کی خواہشات کے مطابق طے کرتا ہے اور ایک سڑک چھاپ مولوی جماعت کے ارباب حل وعقد علما ومشائخ سے ان کی سنیت کا سرٹیفکیٹ مانگتا ہے۔اسی ماحول نے عوام کو تکفیری مزاج کا خوگر بنا دیا ہے،عوام چاہتے ہیں کہ چند سروں کے سوا پوری دنیا کی تکفیر کر دی جائے۔خواص اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن عوام سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اظہار حق کر دیں تو خود ہمارے ایمان کے لالے پڑ جائیں۔

مولانا اسید الحق نے چونکہ اپنی اس تحقیق سے جماعت اہل سنت کا علمی موقف واضح کر دیا ہے کہ ۷۲ فرقے امت اجابت سے ہیں، گمراہ ہیں، اپنی گمراہی کی سزا جھیلنے کے بعد دامن رحمت

پروردگار میں چھپ سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ:

فرقے جو ضروریات دین کا انکار کر کے باجماع امت کافر و مرتد ہو گئے وہ دراصل امت اجابت سے نکل کر اب امت دعوت میں شامل ہو گئے۔ وہ اپنے کفر کی وجہ سے دائمی عذاب کا مزہ چکھیں گے، ایسے فرقے ملت اسلامیہ سے خارج ہیں، ان کا شمار نہ اسلامی فرقوں میں ہوگا اور نہ وہ ان ۷۲ فرقوں میں گنے جائیں گے۔ (ص:۷۰)

مولانا اسید الحق نے یہ بات بھی بڑی اچھی کہی ہے کہ:

کسی فرقے کے کسی شخص معین کی تکفیر اور اس پورے فرقے کی تکفیر میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہاں گفتگو فرقوں کی ہو رہی ہے شخصیات کی نہیں اور پھر کسی قول کے کفر ہونے اور اس کے قائل شخص معین کی تکفیر میں بھی فرق ہے۔ (ص:۷۱)

ہم بصد ادب و احترام اپنے بڑوں سے عرض گزار ہیں کہ وہ جماعت سے جہالت کا طلسم توڑنے کی کوشش کریں اور عالموں پر جاہلوں کی حکمرانی اور پیروں پر مریدوں کے تسلط کے جو کالے بادل چھائے ہیں انہیں صاف کر کے مطلع کو بے غبار کرنے کی سعی بلیغ کریں۔ دین کے رہنما علما و مشائخ ہیں، سیاسی لیڈر، امیر و کبیر، ڈاکٹر، انجینئر، بنیے اور مارواڑی نہیں۔ اسلام علم و بصیرت کا مذہب ہے نہ کہ درہم و دینار کا۔

بات جب حدیث افتراق امت کی ہوتی ہے تو لازمی طور یہ سوال اٹھتا ہے کہ فرقۂ ناجیہ کی تعریف کیا ہے؟ اس کے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس کا احساس مولانا اسید الحق کو بھی ہے، فرماتے ہیں:

یہ مقالہ ادھورا رہے گا اگر اس میں 'فرقۂ ناجیہ' کی تعریف اور **ما انا علیہ واصحابی** کی تشریح نہ جائے۔ (ص:۷۲)

اس کے بعد مولانا نے علمی انداز میں ۳؍صفحات پر داد تحقیق دی ہے مگر اس کم فہم کے نزدیک نہ تو ''فرقہ ناجیہ'' کی تعریف ہوسکی ہے اور نہ **ما انا علیہ واصحابی** کی تشریح، اور اس طرح یہ

مقالہ ادھورا ہی رہ گیا ہے۔ اگر اس ایک کمی کو کوئی شخص مقالے پر تشویش کا باعث قرار دے تو مَیں اس کا ہمنوا ٹھہروں گا۔ لیکن میرے خیال سے موجودہ تشویش کی یہ وجہ نہیں ہے، وجہ وہی ہے کہ ۷۲؍ فرقوں کو کافر اور جہنم کا دائمی مستحق نہیں کہا گیا ہے۔

کتاب کے بنیادی موضوع کی اہمیت و افادیت اور جامعیت کے علاوہ اگر کتاب کے اسلوب، معیار و اندازِ تحقیق، زبان و بیان، نقد و نظر اور معارضات و معروضات کی بات کریں تو ہمارے یہاں اس معیار کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ اصلاح فکر اور تصحیح عقیدہ کے علاوہ یہ کتاب جدید اہل قلم اور طلبۂ مدارس کے لیے زبان و بیان اور اندازِ تحقیق کی جہت سے بھی بہت زیادہ اہم اور مفید ہے۔ [ص:۶۰]

(ماہنامہ جامِ نور دہلی، نومبر ۲۰۰۹ء، ص: ۵۹، ۶۰)

☆☆☆

# حدیث افتراق امت: تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں

مولانا اسید الحق قادری

ظفر حسنین

☆

کتاب کا موضوع حدیث افتراق امت ہے، یعنی وہ حدیث جس میں امت کے تہتر فرقوں میں بٹ جانے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اسناد اور معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس حدیث کا تحقیقی مطالعہ مقصد تالیف ہے۔ مصنف ہیں مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری جو اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کی وجہ سے علمی حلقوں میں کافی معروف ہو چکے ہیں۔ موصوف خانقاہ قادریہ بدایوں کے زیب سجادہ حضرت مولانا شاہ عبد الحمید محمد سالم قادری مدظلہ العالی کے صاحبزادے ہیں اور جامع ازہر مصر سے فارغ التحصیل ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ بندی اور اختلاف و تحزب پر مصنف کی فکرمندی قابل تعریف ہے۔ وہ تمہید میں تحریر کرتے ہیں:

> اس افتراق و انتشار نے امت کو علمی، فکری، سیاسی اور سماجی ہر ہر سطح پر نقصان پہنچایا اور آج تک پہنچا رہا ہے۔ اس فرقہ بندی کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ تبلیغ اسلام اور اس کے دفاع سے زیادہ ہر فرقے کو دوسرے فرقے کے مقابلے میں اپنے دفاع کی فکر ہو گئی اور ساری علمی و فکری قوتیں اسی میں صرف کر دی گئیں اور آج تک کی جا رہی ہیں۔ مسلک حق کا اثبات اور باطل افکار و نظریات کا ردو ابطال ایک دینی فریضہ ہے جس کی ہر حال میں ضرورت ہے تاکہ حق و باطل میں امتیاز رہے۔ لیکن ایک منظّم سازش کے تحت ہمیں ان مسائل میں الجھا دیا گیا تاکہ دوسرے اہم [ص:۷۰] مسائل کی طرف سے توجہ ہٹی رہے۔ یہ سازش اس حد تک کامیاب رہی کہ آج تک ہم دامے، درمے، قدمے، سخنے ان ہی مسئلوں میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ ملکی سطح پر مسلمانوں کو اندلس کی طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سازشیں ہوں یا عالمی سطح پر دشمنان اسلام کی ریشہ دوانیاں، اپنے تحفظ و بقا اور وقار و تشخص کو درپیش ان خطرات کی طرف توجہ

کرنے کا ہمارے پاس وقت نہیں ہے (ص:۱۰)

کتاب میں پہلے اس حدیث کی سندی حیثیت کا تذکرہ کیا ہے کہ اس کو ۱۸ر صحابہ کرام نے روایت کیا ہے اور یہ صحت کے اعلیٰ درجے پر ہے۔ اس کے بعد اس کے مفہوم پر بحث شروع کی ہے۔ امت سے کون سی امت مراد ہے امت دعوت یا امت اجابت؟ امت اجابت مراد ہونے کو ترجیح دی ہے **کلها فی النار** سے کیا مراد ہے؟ خلود فی النار یا دخول فی النار؟ امت کی دس ممتاز شخصیات سے اس حدیث میں دخول فی النار مراد ہونے کا قول نقل کیا ہے۔ جن میں امام ابوالحسن اشعری، امام بیہقی، امام ابوالمظفر اسفرائنی، مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، محقق دوانی، شاہ عبدالعزیز دہلوی وغیرہ ہیں۔ پھر مصنف **کلها فی النار** پر اپنا موقف اس طرح بیان کرتے ہیں:

> یہاں ہم فی النار سے دخول فی النار مراد لینے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر فرقے اہل بدعت کے ہیں، اہل کفر کے نہیں اور اہل بدعت تعذیب کے باب میں مسلمان فاسق کے حکم میں ہیں.....فاسق کے لیے صرف دخول فی النار کا حکم ہے۔

خلاصۂ بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اہل قبلہ کی تکفیر بہت نازک مسئلہ ہے۔ اس میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ حتی الامکان تاویل کر کے تکفیر سے زبان کو روکا جائے گا۔

اس دور کے بعض اہل علم نے امت سے امت دعوت مراد لیا ہے۔ اسی طرح بعض معاصر اہل علم اس حدیث کو موضوع قرار دے رہے ہیں۔ مصنف نے ایسے حضرات کے دلائل کا جائزہ لے کر ان کے موقف کی مدلل تردید کی ہے۔

کتاب اپنے موضوع پر جامع و حاوی ہے۔ مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کا کاغذ عمدہ اور طباعت بہت صاف ہے۔ مضمون مرتب انداز میں ذیلی عناوین کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے موضوع کے کچھ خشک ہونے کے باوجود دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ [ص:۱۷]

(سہ ماہی المجیب، پٹنہ، اپریل، مئی، جون ۲۰۰۹ء، ص: ۷۰،۱۷)

☆☆☆

# مردے سنتے ہیں

## مولانا حکیم عبدالقیوم قادری بدایونی

ظفر حسنین

☆

مولانا حکیم عبدالقیوم قادری بدایونی (م ۱۳۱۸ھ) کی یہ ایک تصنیف ہے، جو سماع موتی کے موضوع پر ہے۔ مولانا موصوف کا تعلق بدایوں کے عثمانی خانوادے سے ہے۔ مشہور عالم اور مجاہد آزادی حضرت مولانا عبدالماجد بدایونی کے والد ماجد ہیں۔ شروع میں تعارف مصنف کے عنوان سے مولانا اسیدالحق محمد عاصم قادری کے قلم سے گیارہ صفحات پر مشتمل ایک تحریر ہے جس سے مصنف کی علمی و دینی شخصیت اور ان کی سرگرم حیات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس میں مؤلف نے سماع موتی سے متعلق اچھا خاصا مواد جمع کر دیا ہے اور جو حضرات اس کے منکر ہیں ان کے دلائل کا جواب بھی مثبت انداز میں پیش کیا ہے۔ سماع موتی سے متعلق ملا علی قاری علیہ الرحمہ کا ایک قول ہم اس سے نقل کرتے ہیں، اس سے اس کا طرز بیان بھی معلوم ہو جائے گا:

> تمام مردے بھی سلام و کلام کو سنتے ہیں اور بعض ایام میں ان پر ان کے اقارب و اعزا کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ انبیائے کرام کی حیات مبارکہ بدرجہ اتم و اکمل ثابت ہے اور بعض وارثین انبیا جیسے شہدا، اولیا، علما ان حضرات کو اپنے جسموں کے تحفظ میں وافر حصہ ملا ہے۔ (یعنی بعض اولیا کے اجسام بھی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں) بلکہ یہ اہل اللہ اپنی قبور مبارکہ میں نماز، تلاوت قرآن وغیرہ عبادات سے لذت حاصل کرتے ہیں اور یہ قبور میں عبادات سے لطف اندوزی تا قیام قیامت جاری رہے گی۔

یہ تمام مسائل وہ ہیں جن کو علامہ سیوطی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ''شرح

الصدور فی احوال الموتی والقبور ''میں احادیث صحیحہ سے ثابت کیا ہے۔(ص:۲۳)

اس موضوع پر علامہ تقی الدین سبکی، علامہ ابن قیم، علامہ تفتازانی، علامہ سیوطی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ عبدالغنی نابلسی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ملا بحر العلوم فرنگی محلی وغیرہ دیگر اکابر علما کے اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب اپنے موضوع پر مختصر مگر جامع ہے۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ عمدہ کمپوزنگ بھی بہت صاف ہے۔[ص:۷۰]

(سہ ماہی المجیب، پٹنہ، جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۹ء، ص:۷۰)

☆☆☆

# مختصر سیرت خیر البشر

## مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی

غلام مصطفیٰ رضوی

☆

اکابر بدایوں کی دینی و مسلکی خدمات کا دائرہ ایک صدی سے زائد عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ عقیدہ ومسلک کی حمایت میں تحریری طور پر اکابر بدایوں نے جو کارنامہ انجام دیا اُس نے وہابیہ کے عزائم فاسدہ کی قلعی کھول دی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد برصغیر میں ایمان وعقیدے پر انگریز کے زیر اثر جو شب خون مارا گیا اُس سے ملت اسلامیہ زخموں سے چور چور ہوگئی۔ دینی فرقوں کی نمود نے خوش عقیدگی کی فضا کو متاثر کیا، اسمٰعیل دہلوی کی لگائی ہوئی چنگاری شعلہ بن چکی تھی، اس آگ پر قابو پانے کے لیے علمائے حق نے جو کدوکاوش کی اُس گروہ کے سرخیل کہے جا سکتے ہیں۔ اکابر بدایوں اور بعد کے دور میں باطل فرقوں کا استیصال کلی کلکِ رضا سے ہوا۔ بدایوں و بریلی کا یہ اعتقادی کارنامہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا زریں باب ہے۔ علمائے بدایوں نے اپنے علمی و قلمی کاموں کی بدولت اہل سنت کی نمایاں خدمت انجام دی۔ اس بدایوں کے عثمانی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں مولانا عبدالہادی بدایونی، جن کی تصنیف ''مختصر سیرت خیر البشر'' راقم کے پیش نظر ہے۔ مصنف کی ولادت ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں بدایوں میں ہوئی۔ آپ حضرت مولانا عبدالقدیر بدایونی کے صاحبزادے ہیں، آپ کی تربیت اور تعلیم مدرسہ قادریہ بدایوں میں ہوئی۔ درس و تدریس کا فریضہ مدرسہ قادریہ بدایوں، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، نظام کالج حیدرآباد میں انجام دیا۔ شاعر و ادیب اور صوفی منش بزرگ تھے۔ ۱۱ر محرم الحرام ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء میں بدایوں میں وصال فرمایا۔

یہ سیرتِ طیبہ پر ایک مختصر اور اہم کتاب ہے جسے تاج الفحول اکیڈمی بدایوں نے شائع کیا۔ کتاب کی تربیت و تقدیم کا سہرا مولانا اسید الحق قادری کے سر ہے جو یکے بعد دیگرے علمائے بدایوں کی تحریروں کو اشاعت کا جامہ زیب کرا رہے ہیں۔ سیرت پر یہ کتاب بیانیہ نثر میں لکھی گئی

ہے۔انداز عام فہم ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ عوام زیادہ سے زیادہ مستفید ہو۔ کتاب کی نوعیت تاریخی زیادہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی نگاہ مؤرخانہ ہے۔ نیز باریک سے باریک گوشہ بھی اُن کے پیش نظر ہوتا ہے، جسے وہ اپنی نثر میں بیان کرتے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں جن پہلوؤں پر وضاحت وصراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے وہ اِس طرح ہیں: ملک عرب کی آبادی، طبقات عرب، جاہلیت میں نظام حکومت، ادیان، اخلاق ومعائب، ایام العرب، حجاز کے حالات، بعثت رسول اللہ ﷺ، دعوت وتبلیغ اور اس کا اثر، کفار کا سلوک، ہجرت، غزوات، صلح حدیبیہ، سفارتیں، خطبہ حجۃ الوداع، خلافت راشدہ وغیرہ۔ مصنف موصوف نے سید کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے قبل اور آمد کے بعد کے حالات کو تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مولانا اسید الحق نے کتاب کا عنوان تجویز کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> زیرنظر رسالے کا مسودہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا اُن کی صاحبزادی بیگم سید اکرام احمد رزاقی کے پاس موجود تھا۔ اس پر رسالے کا کوئی نام درج نہیں تھا۔ کتاب کے موضوع اور اسلوب اختصار کو دیکھتے ہوئے اس کا نام ''مختصر سیرت خیر البشر'' زیادہ مناسب معلوم ہوا''۔ (ص:۸)

بہرکیف رسالہ اِس لائق ہے کہ اسے داخل نصاب کیا جائے تاکہ طلبا سیرت طیبہ سے واقف ہوں۔ اس طرح کے لٹریچر کی اشاعت لائق تحسین ہے۔(ہفت روزہ انوار مالیگاؤں، ۱۸؍اپریل ۲۰۱۱ء)

(ہفت روزہ ''انوار'' مالیگاؤں، ۱۸؍اپریل ۲۰۱۱ء، پیر، جمادی الاول ۱۴۳۲ھ)

☆☆☆

# احوال ومقامات

مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی

ظفر حسنین

☆

یہ رسالہ خانقاہ قادریہ بدایوں کی دو اہم ترین شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ مولانا شاہ عبدالمقتدر قادری بدایونی اور مولانا شاہ عبدالقدیر بدایونی کے حالات و واقعات کو بڑے عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف مؤخر الذکر بزرگ کے صاحبزادے ہیں جو خود کو محمد قادری لکھتے ہیں۔ صحیح واقعات بڑے اچھے انداز میں رقم کیے گئے ہیں۔ انداز تحریر میں بڑی سادگی اور سلاست ہے، جس سے پڑھنے میں طبیعت لگتی ہے۔ مولانا عبدالمقتدر بدایونی کے حالات ۳۸ صفحات میں ہیں اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کے حالات ۶۰ رصفحات میں ہیں۔ دونوں بزرگان اپنے بھائی ہیں۔ مگر عمر میں کافی تفاوت ہے۔ مؤخر الذکر متقدم الذکر کے مرید و خلیفہ اور جانشین بھی تھے۔ دونوں کی علم وتصوف سے متعلق خدمات اور سیاسی خدمات کا عمدہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً مولانا عبدالقدیر بدایونی کی جنگ آزادی سے متعلق سیاسی خدمات کافی اہم ہیں۔ انجمن خدام کعبہ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حسرت موہانی، علی برادران، مولانا عبدالماجد بدایونی، گاندھی جی وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے۔ مولانا موصوف کا سفر بیت المقدس، مفتی امین الحسینی سے تعلقات، فلسطین میں قیام، اسرائیل سے متعلق حکومت برطانیہ کی سرگرمیوں کا جائزہ وغیرہ خاصہ کی چیز ہے، جس کے بارے میں اس سے پہلے تفصیلات سامنے نہیں آئی ہیں۔ حضرت سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے خاص عقیدت واحترام کی وجہ سے متعدد مرتبہ ان بزرگوں کی بغداد حاضری اور وہاں کے مشائخ خاص تعلقات کا بھی اس میں تذکرہ کیا گیا ہے، رسالے کی طباعت عمدہ اور کاغذ بھی بہترین ہے۔ ان بزرگوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے۔ شروع میں مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کا ابتدائیہ بھی ہے۔ اس میں انہوں نے مصنف کے کچھ حالات بھی ذکر کیے ہیں۔ مصنف ان کے حقیقی چچا اور حضرت مولانا شاہ عبدالحمید محمد سالم

قادری مدظلہ العالی کے بڑے بھائی تھے۔ تاج الفحول اکیڈمی سے مولانا محمد عاصم قادری جو کتب و رسائل منظر عام پر لا رہے ہیں وہ کافی اہم اور قیمتی ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ قائم رہے۔[ص:۷۲]

(سہ ماہی المجیب، پٹنہ، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء ص:۷۲)

☆☆☆

# سالنامہ اُفق بدایوں

(مدیر صاحبزادہ محمد عزام قادری قدسی بدایونی)

مولانا ظفرالدین برکاتی

☆

شہر/ قصبہ بدایوں کی تاریخ میں ایک دور ایسا گزرا ہے کہ وہاں کا جو گورنر ہوتا تو وہ دہلی کے مرکزی تخت سلطنت پر ضرور بیٹھتا تھا، اسی طرح علمی اعتبار سے بھی اس کی تاریخی حیثیت قابل ذکر ہے اور قدیم بھی۔ یوں ہی تاریخ ہند کے امتیازی باب ''جنگ آزادی ہند'' میں خون پسینہ، مال و دولت کے ساتھ جان کی بازی لگانے والے افراد وشخصیات کے لحاظ سے بھی بدایوں کسی سے کم نہیں۔ مجاہد انقلاب آزادی علامہ فیض احمد عثمانی، تاج الفحول علامہ عبدالقادر بدایونی، مفتی عبدالقدیر قادری (مفتی اعظم حیدرآباد) اور مجاہد آزادی علامہ عبدالحامد قادری بدایونی (صدر جمعیۃ علمائے پاکستان) کی علمی، تحقیقی، مذہبی، جماعتی اور قومی ملی خدمات وکارنامے سے زمانہ واقف ہے۔اس تاریخی تناظر میں اہل فکر وقلم کا یہ کہنا یقیناً بجا ہے کہ ع

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں کی تاریخ دوصدی پرانی ہے، یہ مدرسہ پہلے ''مدرسہ شمسیہ'' پھر ''مدرسہ معزیہ'' پھر ''مدرسہ محمدیہ'' جب کہ ۱۸۲۱ء کے قریب علامہ شاہ عبدالمجید قادری بدایونی کی اجازت وحکم سے سیف اللہ المسلول علامہ شاہ فضل رسول قادری بدایونی نے اس کی نشاۃ ثانیہ کی پھر ''مدرسہ عالیہ قادریہ'' کے نام سے ترقی دے کر تاریخ بدایوں میں ایک زریں باب کا اضافہ کردیا۔ اس کے بعد حسب سابق عثمانی خانوادے کے بزرگ اور جلیل القدر علمائے کرام کی تدریسی دلچسپیوں کی بدولت حسب حال چلتا رہا۔ پھر دوصدی بعد اسی خانوادے کے علمی امین و پاسدار نوجوان عالم دین مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری نے دنیا کی قدیم ترین تاریخی اسلامی یونیورسٹی جامع ازہر مصر سے فراغت کے بعد ۲۰۰۴ء میں دوبارہ اس کی نشاۃ ثانیہ کی ہے اور مدرسہ عالیہ قادریہ اور بدایونی عثمانی خانوادے کو، اس کے بزرگوں کی تصنیفات، تالیفات، تراجم اور پھر

سب کے نتیجے میں شہر بدایوں کو دوبارہ تاریخ ہند کا زریں باب بنانے میں یوں کامیاب ہو گئے کہ اگر کوئی مؤرخ یا تذکرہ نگار علم وادب، تاریخ وسیرت، ترجمہ وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے حوالے سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ لکھے تو شخصیات کی علمی خدمات کی فہرست میں مولانا اسید الحق کا نام لکھے بغیر اس کی کتاب بہر حال نامکمل ہوگی اور ماضی کی تاریخ کے تذکرہ سے آنکھیں چرانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

زیر تبصرہ مجلّہ مدرسہ عالیہ قادریہ کا پہلا سالانہ علمی مجلّہ ''افق'' اسیدی دور نشاۃ ثانیہ طلبہ مدرسہ عالیہ قادریہ کی قلمی نگارشات کا خوبصورت مجموعہ ہے، جس کے سبھی مضامین علمی اور تحقیقی نوعیت کے ہیں، اسلوب خطیبانہ اور مناظرانہ کی بجائے حسب توقع تحقیقی اور علمی ہے اور انجام کار کے اعتبار سے طلبہ کے مقالات کا مجموعہ ہونے کے باوجود معلوماتی ہے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کی خاطر ابتدا میں خانوادۂ عثمانی بدایونی کے بزرگ عالم دین علامہ شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری کے ''کلمات مبارکہ'' حضرت کے تعلق سے طلبہ کے اِس اعتقادی جذبے کا اعلان کر رہے ہیں کہ ع

مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

جب کہ صاحبزادہ اسید الحق صاحب کے اظہارِ بجا ''مرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا'' کے تحت اپنے بزرگوں کی خدمات کے اعترافی کلماتِ ابتدائیہ سے اس جذبے کا اعلان نمایاں ہے کہ:

یہ سب پودا نہی کی لگائی ہوئی ہے

اس کے بعد مدیر مسئول کا تفصیلی اور معلوماتی اداریہ ہے جس میں مدرسہ قادریہ کے ماضی، حال، مستقبل، نصاب ونظام تعلیم اور اساتذہ وطلبہ کی تصنیفی، تالیفی اور مقابلہ جاتی سرگرمیاں وغیرہ کی روداد بیان کی گئی ہے، معاً بعد ماہنامہ جامِ نور میں بطور اداریہ شائع شدہ مولانا اسید الحق صاحب کی اسلامی سال رواں کے ماہ ربیع الاول کی پیش قدمیوں سے متعلق تحریر شامل ہے، پھر مولانا دلشاد احمد قادری استاذ مدرسہ قادریہ کے ایک تحقیقی مقالے کے بعد آٹھ طلبہ کے معیاری مضامین شامل اشاعت ہیں۔ [ص:۶۱]

(ماہنامہ کنز الایمان، دہلی دسمبر ۲۰۱۰ء، ص:۶۱)

☆☆☆

# سالنامہ اُفق بدایوں

(مدیر صاحبزادہ محمد عزام قادری قدسی بدایونی)

مولانا نورین علی حق

☆

عرصے سے مدارس و جامعات اپنے طلبہ کا ترجمان شائع کراتی رہی ہیں، جن میں ان کے افکار و آرا، تحقیق وتنقید اور تجزیاتی مطالعات پر مشتمل مضامین و مقالات شایع کیے جاتے ہیں۔ ہندوستانی مدارس میں بھی یہ روایت بلا اختلاف مکاتب فکر بڑی پرانی ہے۔ ہندوستان میں جتنے اہم اور بڑے مدارس ہیں وہاں سالنامے کی شکل میں اب بھی طلبہ اپنے افکار وخیالات پیش کرتے ہیں، جن میں اسلامی علوم وفنون کے علاوہ ادبیات کے حوالے سے بھی مضامین نظر نواز ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں خاص طور پر گفتگو کا محور مدارس اسلامیہ ہیں۔ ماضی قریب میں ایک ادارہ کا سالنامہ نظر سے گزرا، جس میں افسانے، ڈرامے اور خاکے وغیرہ بھی تھے۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، شاید یہی وجہ ہے کہ آج اردو ادب میں بڑے نام کسی نہ کسی طرح مدارس سے تعلق رکھتے ہیں۔ معاصر ناول وافسانہ، تنقید وتجزیہ اور تحقیقات کا نصف حصہ، اگر سروے کیا جائے تو مدارس کے فارغین کے کھاتے میں چلا جائے گا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو زبان وادب کی بقا آج کی تاریخ میں مدراس اسلامیہ سے ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بعض کالج و یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ پر میرا یہ دعویٰ گراں گزرے، لیکن وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے، بصورت دیگر اپنے اپنے شعبۂ اردو میں معلوم کریں گے تو یہ سچائی اظہر من الشّمس ہو جائے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسکول کے ثانوی درجات میں طلبہ جب اردو کی عبارت خوانی سیکھ رہے ہوتے ہیں، انہیں ثانوی درجات میں مدارس کے طلبہ قلم وقرطاس لیے مشق کرنی شروع کر دیتے ہیں اور عالمیت کے بعد جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجز اور یونیورسٹیز کا رخ کرتے ہیں تو ان کا اصل جوہر سامنے آجاتا ہے اور نوک و پلک سنوار کر وہ میدانِ تنقید وتحقیق میں اشہب قلم دوڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ بہرحال میری گفتگو کا مقصد قطعی یہ بھی نہیں کہ مدارس کا ہر طالب علم باکمال

ہوتا ہے، مدراس و جامعات ہر جگہ زوال و انحطاط کا دور دورہ ہے۔ دس فیصد طلبہ ہی بلکہ اس سے بھی کچھ کم خود کو علم وعمل سے پوری طرح لیس کر پاتے ہیں۔ اکثریت تو سیر و تفریح میں ہی وقت گزار کر واپس اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہے اور نہ ہی اب پہلے کی طرح معیاری مجلّے مدارس و جامعات سے منظر عام پر آ رہے ہیں الا ماشا اللہ۔ انہی الا ماشا اللہ میں ایک خانقاہی مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں کو ضرور رکھا جانا چاہیے، جہاں کے طلبہ نے بڑا علمی و تحقیقی مجلّہ ''افق'' کے نام سے شایع کیا ہے، حالانکہ اس مجلّے میں ادبیات کے حوالے سے کوئی مقالہ نہیں ہے، البتہ اس کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس طرح ادب کے خزانے پر تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی نگاہ ڈالی جا رہی ہے، اسی طرح اسلامی علوم وفنون کے خزانوں پر بھی تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی نگاہ ڈالنے کا زمانہ نئی نسل میں عود کر رہا ہے، جس کی خشت اول طلبۂ مدرسہ عالیہ قادریہ ہیں۔

مجلّے کا انتساب دنیا سے گزر جانے والے مدرسہ عالیہ قادریہ کے نامور فارغین کے نام کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مجلّے کے سرپرست حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری سجادہ نشین خانقاہ قادریہ و سرپرست مدرسہ قادریہ بدایوں ہیں۔ نگراں مولانا دلشاد احمد قادری ہیں اور ایڈیٹر صاحبزادہ محمد عزام قادری ہیں، جو خود مدرسے کے طالب علم بھی ہیں۔

سب سے پہلے ''کلمات مبارکہ'' کے عنوان سے سرپرست محترم کی تحریر شامل ہے، جس میں امید افزا دعائیں دی گئی ہیں اور طلبہ کی سرگرمیوں کو سراہا گیا ہے۔ ''مرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا'' کے عنوان سے مدرسے کے شیخ الحدیث مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری نے اظہار خیال کیا ہے، جو لائق مطالعہ ہے۔ ہر ہر سطر فتح و کامرانی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ مولانا کے ابلنے کا جو تیور ہے وہ لائق ملاحظہ ہے۔ پچاس سالہ صبر وتحمل کو چند سطروں میں نچوڑ کر رکھ دیا ہے ''قوموں، جماعتوں اور اداروں کی تاریخ میں نشیب وفراز اور کمال و زوال قانون فطرت کا حصہ ہے، اس فطری قانون کے سبب مدرسہ قادریہ نے بھی اپنے سفر میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے، مگر یہ بانیان مدرسہ کا اخلاص، ان کی روحانی توجہات اور تاجدار اہل سنت سرپرست مدرسہ قادریہ کی جہد [ص:۵۷] مسلسل، صبر و رضا اور خاموش خدمت کا نتیجہ ہے کہ گذشتہ پچاس برسوں میں مدرسہ قادریہ نے ہر قسم کے ناسازگار حالات کا پورے حوصلے اور پامردی سے مقابلہ کیا اور حالات کے نشیب وفراز

کے باوجود آج ایک بار پھر اس حقیقت کو ثابت کر دکھایا:

”کہ رات گر کسی خورشید کو شہید کرے

تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے“

مدرسہ عالیہ قادریہ جیسا کہ موصوف نے بیان کیا، زوال کا شکار تھا۔ مولانا اسید الحق صاحب اس وقت زیرِ تعلیم تھے۔ جامعہ از ہر مصر سے واپسی پر دسمبر ۲۰۰۴ء میں انہوں نے مدرسے کی نشاۃ ثانیہ کی اور اپنے آباواجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بڑی خاموشی سے قوم وملت کے نونہالوں کو علم وعمل سے لیس کرنا شروع کیا۔ آج جو خوش کن نتیجہ ہمارے سامنے ہے، وہ انہی کی جاں کاہ محنتوں کا ثمرہ ہے۔ ۲۰۱۱ء میں مدرسے سے فضیلت کے طلبہ فارغ ہوں گے، انہیں موصوف نے اعدادیہ سے فضیلت تک پڑھایا ہے۔ ان تمام طلبہ کی ذہنی وعلمی تعمیر وتشکیل کا سہرا بجا طور پر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کے سر جاتا ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ طلبہ کے اکثر مضامین پر موصوف کے اثرات غالب ہیں۔ موضوع کا انتخاب بھی انہوں نے ہی کیا ہے۔ نگرانِ افق مولانا دلشاد احمد قادری بھی ان کے شاگردوں میں ہیں۔ ان پر اعتماد کرتے ہوئے افق کی نگرانی کی ذمہ داری ان کے حوالے کی، جس کا انہوں نے حق ادا کیا ہے۔ طلبہ نے مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کی تربیت اور ہدایات کے مطابق اپنے مضامین تحریر کیے ہیں۔

صاحبزادہ محمد عزام قادری کا اداریہ صرف پانچ صفحات کا ہے اور اس میں مدرسے کی تاریخ، چند نامور فارغین کی فہرست، مدرسہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ، تعلیم، نصاب، نظام، نصاب تعلیم کی تبدیلیاں، طلبہ کی نصابی ومسابقاتی سرگرمیاں بیان کر دی گئی ہیں۔ اداریے کے مطالعے سے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اسے عالیہ کے کسی طالب علم نے تحریر کیا ہے۔ مشاق قلم، سینہ میں جذبات کا وفور، اظہار مافی الضمیر کا سلیقہ، ترتیب وتہذیب کا ہنر، قوت برداشت یہاں سب کچھ موجود ہے۔ البتہ جس نظام کو عزام میاں نے پیش کیا ہے، اس میں چند چیزوں کا اضافہ ہونا چاہیے، ان میں مجادلۃ الشعریہ، بیت بازی، مختلف زبانوں میں جداریوں کا اجرا، بزم مقالہ خوانی اور بزم خطابت میں عربی، انگریزی اور ہندی زبانوں کو شامل کرنا چاہیے تاکہ عمومی طور پر طلبہ میں لکھنے پڑھنے کا شوق بیدار ہو سکے اور ابتدا ہی سے وہ ان میدانوں میں قسمت آزمائی کا موقع تلاش کرنا شروع کر

دیں۔

مجلّے میں مدرسے کے دو اساتذہ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری اور مولانا دلشاد احمد قادری کا مضمون بالترتیب ''دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے'' اور ''صحیفہ ہمام بن منبہ کی تاریخی اہمیت اور بازیافت'' بھی شامل ہے، جو اصولی طور پر نہیں ہونا چاہیے چونکہ ''افق'' طلبہ کا ترجمان ہے نہ کہ اساتذہ کا تختۂ مشق۔ مولانا دلشاد احمد قادری بحیثیت نگراں کچھ لکھتے تو طلبہ کے ذہنی رجحانات اور احساسات سے قارئین واقف ہوتے، انہیں بھی پتہ چلتا کہ ''افق'' کو یہ شکل دینے میں نگراں کو کتنی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ''دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے'' کی یہاں موجودگی کی وجہ جواز بس ایک ہو سکتی تھی کہ اس مضمون میں خانقاہ و مدرسے کی سرگرمیاں پیش کی گئی ہیں، جنہیں اس سے پہلے ہی عزام میاں نے بالتفصیل پیش کر دیا ہے، جس کے بعد اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ مولانا کا یہ نصف سال پرانا مضمون ہے۔

بعد میں طلبہ کے آٹھ مقالات ہیں جن میں ''معراج رسول تحقیقی مطالعے کی روشنی میں'' مبشر احمد قادری، ''تفسیر بالرائے میں دخیل اور اس کے اسباب'' محمد رضوان قادری، ''مقدمہ صحیح مسلم ایک تحقیقی مطالعہ'' بدر عالم قادری، ''حدیث وحی تحقیقی مطالعے کی روشنی میں'' محمد خالد قادری، ''سیدنا ابن عباس کا علمی مقام اور ان کا منہج تفسیر'' کاشف نہاد قادری، ''کبار محدثین کے رواۃ: جرح و تعدیل کی روشنی میں'' محمد عاصم اقبال مجیدی، ''سب غیر مسلم یکساں نہیں'' محمد سفیان قادری نے تحریر کیے ہیں۔ یہ تمام مقالات جیسا کہ مدیر مجلّہ نے بتایا ہے، سالانہ اسائنمنٹ ہیں، مجموعی طور پر مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں۔

تحقیقی منہج ہم عصر اسلوب تحقیق کے مطابق ہے۔ پہلے اختیار کردہ مضمون کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں ائمہ کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں تو وہ بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ماضی میں اگر اس پر بحث ہو چکی ہے تو ان بحثوں کو بھی رکھا گیا ہے۔ مراجع کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر استاذ نے دوران درس کوئی نکتہ بیان کیا ہے تو اسے بھی حاشیے [ص:۵۸] میں درج کر دیا گیا ہے، البتہ طلبہ نے خود کو اپنے مکتب فکر کے مصنفین کی کتابوں تک محدود رکھا ہے بالخصوص اردو کتابوں کے سلسلے میں یہ رویہ روا کر لیا گیا ہے، حالانکہ تحقیقی مزاج رکھنے والوں کو یہ تحفظات

راس نہیں آتے۔ اگر مبشر احمد قادری دیگر ہندوستانی مکاتب فکر کے اردو مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کرتے تو ان کا مضمون اور بھی وقیع ہو جاتا۔

محمد انور قادری، محمد رضوان قادری اور بدر عالم قادری تحقیق و تفحص اور تلاش و جستجو سے پیچھے نہیں ہٹے ہیں۔ خاص طور پر محمد خالد قادری نے کتابوں سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ بدر عالم قادری نے ایک درسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ عام طور پر مدارس میں مقدمۂ صحیح مسلم کے تعارف اور اسے لکھانے میں ہی اساتذہ ہفتہ دن صرف کر دیتے ہیں، اس مضمون کے مطالعے سے وقت کی بچت ہوگی اور طلبہ مقدمۂ مسلم مالہ و ماعلیہ سے واقف ہو جائیں گے۔

''سیدنا ابن عباس کا علمی مقام اور ان کا منہج تفسیر'' اور ''کبار محدثین کے رواۃ: جرح و تعدیل کی روشنی میں'' کا حق نہیں ادا کیا گیا ہے۔ یہ مضامین اس قدر اختصار کے حامل نہیں تھے، خاص طور پر مؤخر الذکر مضمون ڈھائی صفحے میں پورا نہیں ہو سکتا، اس کے مطالعے کے بعد تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ مضامین کے مراجع کی فہرست ہر مضمون کے آخر میں دی گئی ہے اور اس میں درمیان میں ہی مرجع اور حوالہ دے دیا گیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مضمون نگار نے تساہل سے کام لیا ہے۔ آخری مضمون ہے ''سب غیر مسلم یکساں نہیں'' جو دراصل ڈاکٹر محمد علی الخطیب کے عربی مضمون ''لیسوا سواء'' کی تلخیص اور آزاد ترجمہ ہے۔ مضمون نگار کے انتخاب پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے قارئین کے اذہان سے بہت ساری بدگمانیاں دور ہوں گی، ہندوستانی مسلمانوں کو برادران وطن کو سمجھنے کا موقع ملے گا، قومی یکجہتی بحال ہوگی۔ ایک خانقاہی مدرسے کا طالب علم کثرت میں وحدت کا متلاشی ہی ہو سکتا ہے۔ معاف کیجیے گا میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ طلبہ نے ماہرین کی طرح محاکے اور خلاصۂ بحث کا بھی التزام رکھا ہے۔ اسلوب میں ناتجربہ کاری کی جھلک بہت ہی کم مقامات پر ملتی ہے۔

میں متحیر ہوں کہ شبلی دوراں کو ایک ساتھ کئی سلیمان کس طرح مل گئے؟ جب کہ ایک صدی قبل شبلی نعمانی کو ایک ہی سلیمان ملے تھے۔ میں یقین کرنے سے قاصر ہوں کہ ایک درجے میں اتنی تعداد میں تحقیقی ذہنیت کے حامل طلبہ ہوں گے، اگر ان سے ان عناوین پر جبری مقالات لکھائے گئے ہیں اور اسی طرح لکھوائے جاتے رہے تو وہ آئندہ اپنی اصل خفتہ صلاحیتوں کو پروان

چڑھانے میں ناکام رہیں گے، لہٰذا ان کی اصل دلچسپی معلوم کی جائے اور اس کے مطابق انہیں عناوین دیے جائیں، اس کے برعکس اگر واقعی تمام طلبہ ان اوصاف سے متصف ہیں تو یہ مدرسہ قادریہ کے حق میں بڑی نعمت ہے۔ اس کی حفاظت کی جانی چاہیے اور سرپرست و اساتذۂ مدرسہ کو بجا طور پر یہ حق حاصل ہے کہ مدیرِ مجلّہ صاحبزادہ محمد عزام قادری کی طرح فرزدق کے شعر میں کوئی تبدیلی نہ کر کے اصل شعر پڑھیں:

**اولائک ابنائی فجئنی بمثلھم**

**اذا جمعتنا یا جریر المجامع**

[ص:۵۹]

(ماہنامہ جام نور دہلی نومبر ۲۰۱۰ء، ص: ۵۷ تا ۵۹)

☆☆☆

# تذکرۂ ماجد

## مولانا اسید الحق قادری بدایونی

یامین انصاری

☆

ہندوستان کے قدیم ترین شہر بدایوں کے قدیم اور عظیم خانوادے سلسلۂ قادریہ کے چشم و چراغ مولانا اسید الحق قادری ازہری نے بہت قلیل مدت میں اپنی تحریر وتقریر سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔انہوں نے کچھ عرصے قبل ہی اپنی تحریری صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کا کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں ہمارے سامنے آگئیں۔خاص طور پر''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ''اور''اسلام، جہاد اور دہشت گردی''نامی کتابوں کو اہل علم و دانش نے خوب سراہا۔زیر نظر کتاب''تذکرہ ماجد''بھی مولانا اسید الحق کی ایک ایسی تخلیق ہے جسے تاریخ کے حوالے سے عرصۂ دراز تک یاد رکھا جائے گا۔مولانا عبدالماجد قادری عثمانی بدایونی نے ملک،قوم اور مسلمانان ہند کے لیے جو خدمات انجام دیں ہیں وہ ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آسکیں،جس طرح کہ آنی چاہیے تھیں۔مولانا عبدالماجد نے نہ صرف قومی وملی جذبے کے ساتھ اپنے مشن کو آگے بڑھایا، بلکہ سیاسی تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قائدانہ کردار ادا کیا۔ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جولائی 1919 میں مولانا محمد علی جوہر نے خلافت کمیٹی قائم کی۔ جس کا مقصد ترکوں پر کیے گئے انگریزوں کے مظالم اور زیادتیوں کو بے نقاب کرنا تھا۔مولانا عبدالماجد اس کے سرگرم رکن تھے۔ اس طرح ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک طرف وہ اپنے خانوادے سلسلۂ قادریہ کے ذریعے ملت کی رہنمائی کرتے تھے تو دوسری جانب سیاسی تحریکوں کے ذریعے ملک وقوم کی خدمات انجام دینے میں پیش پیش رہتے تھے۔ مولانا عبدالماجد کی شخصیت کے بارے میں مولوی سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں

مولانا عبدالماجد کون تھے؟ لکھنے والے ان کے محامد واوصاف صفحوں میں

لکھیں گے اور بیان کرنے والے گھنٹوں میں بیان کریں گے، لیکن اس سارے دفتر کو صرف ایک لفظ میں اگر ادا کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہستی سراپا محبت تھی۔ خدا سے محبت، رسول سے محبت، آل رسول سے محبت، بزرگانِ دین سے محبت، اکابر سے محبت، دوستوں سے محبت، کارکنوں سے محبت، عزیزوں سے محبت۔

زیر نظر کتاب میں مولانا اسید الحق نے مختلف عنوانات کے تحت مولانا عبدالماجد کی عظیم شخصیت کو سامنے لانے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔ 136 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں مولانا عبدالماجد بدایونی کے خاندان کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان کی شخصیت اور خدمات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس میں قومی وسیاسی خدمات، خطابت، قلمی خدمات، بدایوں میں خلافت کمیٹی کا قیام، جمعیۃ علما ہند کا ذکر وغیرہ انتہائی معلوماتی موضوعات ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یقیناً تاریخ کے حوالے سے اور ملک وقوم کے لیے ہمارے علمائے دین کی خدمات کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوگا۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، ۲۱ر ستمبر ۲۰۰۸ء)

☆☆☆

# خامہ تلاشی: جام نور کا ایک یادگار کالم
(ابوالفیض معینی)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شررؔ مصباحی

☆

مولانا خوشتر نورانی کو خدا سلامت رکھے، گرم لوہے پر چوٹ کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے اور کوئی موقع غنیمت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ جام نور کا زیر نظر سوواں شمارہ انہوں نے تحریک جامِ نور کے تعلق سے مشاہیر علم وادب کی نگارشات اور تأثرات کے لیے مخصوص کیا ہے، جس کی چند جھلکیوں میں ''خامہ تلاشی'' جام نور کا ایک یادگار کالم بھی ہے۔ اس عنوان کے تحت مجھے اپنے تأثرات پیش کرنے کا حکم ہوا ہے، جب کہ آں موصوف کو میرا یہ جملہ ازبر ہے کہ ''اب خامہ تلاشی کا انتقادی قلم علم سے زیادہ پندارِ علم کا ڈھنڈورچی ہو گیا ہے''۔

خوشتر صاحب نے خامہ تلاشی کے اس مخصوص کالم کے مندرجات از اپریل ۲۰۰۵ء تا دسمبر ۲۰۰۶ء بہ شمول تعاقب وارباب علم کے تأثرات کتابی شکل میں شایع کر دیے ہیں جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ میرے متذکرہ تبصرے کے باوجود خوشتر صاحب نے خامہ تلاشی پر تأثرات قلم بند کرنے کا حکم دیا ہے، اسے میں آں موصوف کی غیر معمولی ذہانت سمجھتا ہوں انہوں نے ٹھان لی ہے کہ انہیں تلوں تیل نکلے گا اور مَیں بھی تلا بیٹھا ہوں کہ اپنی شکست کا جشن منوا کر رہوں گا۔

جب جام نور میں ''خامہ تلاشی'' کا کالم روشناس ہوا اور ابوالفیض معینی کے نام سے رسالے میں مطبوع نظم ونثر پر بے لاگ تبصرے شایع ہونے لگے تو مَیں بھی اُن خوش نصیبوں میں تھا جن کو نہ صرف جامِ نور کے تازہ شمارے کا بے صبری سے انتظار رہا کرتا تھا بلکہ رسالہ موصول ہونے کے بعد اداریہ اور خامہ تلاشی کا مطالعہ میری ترجیحات میں تھا۔ بہت دنوں تک قارئین کو پتہ نہ تھا کہ ابوالفیض معینی کون بزرگ ہیں۔ بعض اہلِ علم بھی تیہ حیرت میں بھٹکتے رہے لیکن جب مولانا ملک الظفر اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی جیسے اہل نظر بھی سرگرداں نظر آئے تو میری حیرت کی انتہا نہ

رہی کیوں کہ مجھ بے بضاعت کی نگاہ فکر نے خامہ تلاش کو جام نور کے بام تجلی پر پوری تمکنت کے ساتھ نمودار ہوتا دیکھ لیا تھا، وہ کیسے؟ وہ ایسے: ابوالفیض معینی ایک نیا نام تھا جس نے روز اول ہی سے اپنے علم وفن کا مظاہرہ کر کے قارئین کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ ظاہر ہے ایسا متبحر، وسیع الاطلاع، صاحب بصیرت، خوش فکر و خوش بیان قلم کار ایک دم سے زمین کا سینہ چیر کر برآمد نہیں ہوسکتا۔ مَیں نے جماعت کے معروف اہل علم کی اپنے ذہن میں ایک فہرست مرتب کی، ایک ایک نام پر سر کھپاتا رہا، کوئی علم حدیث میں فائق تو عروض و بحور سے نابلد، کوئی منطق و فلسفہ میں کامل تو تاریخ و سیر سے ناآشنائے محض، الغرض ان میں سے کسی میں یکجائی طور پر وہ صفات نظر نہیں آئیں جو ابوالفیض معینی کے رشحات قلم میں تھیں، پھر اسی مجلّے میں مولانا اسید الحق عثمانی کے مضامین زینت نظر ہوتے رہتے تھے جو مختلف اصناف سخن پر محیط ہوتے تھے، مجھے مولانا اسید الحق کے اسلوب نگارش اور مولانا ابوالفیض معینی کے طرزِ تحریر میں ذرہ برابر فرق نہیں محسوس ہوا، اس لیے میں کبھی بھی اندھیرے میں نہیں رہا:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

حالانکہ کئی بار خامہ تلاش نے قارئین کو چکمہ بھی دیا وہ راز کو راز ہی رہنے دینا چاہتے تھے، مثلاً شیدا البستوی کے مصرع ؎

زندگی بھر ہے کیا جس نے اطاعت ان کی

کو قابل غور بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہاں حیدرآباد میں تو اطاعت کی جاتی ہے، ممکن ہے بستی میں ''اطاعت کیا جاتا ہو''۔

اس جملے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ خامہ تلاش کا تعلق سرزمین حیدرآباد سے ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنے فیصلہ پر اٹل رہا اور بطور خود میں نے توجیہ یہ کی کہ یہ تبصرہ موصوف نے اپنے حیدرآباد کے سفر کے دوران کیا ہوگا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ جہاں خامہ تلاش نے جام نور کے شرکائے قلم کو ہدف نقد بنایا ہے، خود کو بھی نہیں بخشا ہے، یہ اس لیے تاکہ پردہ اٹھنے نہ پائے۔

خامہ تلاش کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، اسلوب تحریر بڑا دل پذیر ہے، شعر و ادب کے تعلق سے وہ جو بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس ٹھوس دلائل ہیں اکثر اسے بھی وہ اپنی فہم ناقص کے حوالے کر دیتے ہیں، یوں مخاطب یا[ص:۳۸] مشارالیہ کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے، قارئین رسالہ کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور بدگمانی بھی راہ نہیں پاتی۔ یہ وصف خاص جسے مَیں خامہ تلاش کا بڑکپن کہتا ہوں صرف تعلیم حاصل کر لینے سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ اس خانقاہی نظام تربیت کا ثمرہ ہے جہاں سے آدمی انسان بن کر اور مسترشد اور مرشد بن کر نکلتا ہے اور چٹکیاں لینے میں تو حضرت والا کا کوئی جواب ہی نہیں، ذرا درج ذیل عبارات کی شگفتگی ملاحظہ ہو:

(۱) ''ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب کی نعت شریف اور مناجات دونوں بہت مرصع ہیں ان کی مناجات کا ایک مصرع ہے:

غم فراق میں خوں ریز چشم تر دے دے

''خوں ریز چشم تر'' غالباً جدید ترکیب ہے، اب چونکہ یہ ترکیب صابؔر صاحب جیسے ماہر فن نے استعمال کی ہے لہٰذا درست ہی ہوگی''(ص:۷۲)

یہاں قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ خامہ تلاش نے پہلے تو شاعر کو قوت بخش جملوں سے تنومند کیا پھر اس ساختہ پرداختہ پہلوان کو دھوبی پاٹ پر ایسی پٹخنی دی کہ سنبھلنے کا موقع تک نہ ملا۔

(۲) ''پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے، فن اور زبان دونوں پر ان کی قدرت کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے ان کی منقبت ان کی مہارت اور قادرالکلامی پر شاہد ہے ان کے ایک مصرع پر نظر رک گئی:

شیر خدا علی کرم اللہ وجہہ

ہماری ناقص معلومات کی حد تک کرّم کی را مشدد ہے یا تو ہم اس مصرع کو صحیح پڑھ نہیں پا رہے ہیں یا پھر حضرت برقؔ نے کــرّم کی را کسی عروضی قاعدے کے تحت بجائے تشدید کے تخفیف کے ساتھ نظم کی ہے''۔(ص:۹۸)

دوشیزۂ قلم کی اس رعنائی و برنائی پر ہزار جان سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔

ایک مقام پر فاضل خامہ تلاش نے غریب شآرمصباحی پر بھی کرم فرمایا ہے۔ تفصیلی معروضہ مضمون کے آخر میں ملاحظہ کریں۔

علم حدیث میں خامہ تلاش کی عبقریت مسلّم ہے۔ مولانا اسید الحق کے مضمون ''حدیث افتراق امت'' پر خامہ تلاش رقم طراز ہیں:

> ''مولانا اسید الحق بدایونی کا مضمون 'حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں' غالبًا ایک طویل مضمون ہے جس کی یہ پہلی قسط ہے، ایک فاضل از ہر سے جس قسم کے تحقیقی مضامین کی توقع کی جاسکتی ہے مولانا اس پر ہمیشہ پورے اترتے ہیں'' (ص:۲۶)

اب جب کہ دنیا کو پتا چل گیا ہے کہ مولانا اسید الحق ہی مولانا ابوالفیض معینی ہیں یعنی دونوں کھوپڑیوں میں ایک ہی دماغ ہے تو صاف ظاہر ہے کہ خامہ تلاش کا اس مضمون کے تعلق سے ایک مقام پر یہ کہنا:

> ''کلها فی النار الاواحدة پرانہوں نے (مولانا اسید نے۔ شآر) تحقیقی بحث کرتے ہوئے اس کو کثرت طرق کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے، ہماری ناقص رائے میں یہ کوئی قاعدۂ کلیہ نہیں ہے کہ مطلقاً ہر ضعیف الاسناد حدیث تعدد طرق کی وجہ سے حسن قرار دے دی جائے''۔ (ص:۲۶)

ایک طرح سے اپنے قول کی تصحیح ہے۔

جام نور میں جن دنوں مولانا اسید الحق کا یہ مضمون شایع ہوا تھا میں محدث شہیر شیخ عبداللہ ہرری کے معالج کی حیثیت سے بیروت میں تھا۔ قارئین کو حیرت ہوگی کہ لگ بھگ سو برس کی عمر میں عینک کا احسان اٹھائے بغیر طویل بیماری کی حالت میں بھی شیخ ہرری روزانہ درس دیتے تھے۔ الجزائر، مراکش، سوریہ اور مصر کے علما حاضر ہوتے، دوزانو بیٹھتے، مسائل دریافت کرتے، ہر سوال کا جواب شیخ کی نوک زبان ہوتا، ان ایام میں جام نور کے چند شمارے موصول ہوئے، متذکرہ بالا عنوان کا مضمون بغور پڑھنے کے بعد میں نے طے کیا کہ شیخ سے اس حدیث کے بارے میں بات کروں گا۔ ایک دن بعلبک کے چند علما کی موجودگی میں مَیں نے شیخ سے پوچھا، کیا تعدد طرق سے

حدیث ضعیف حسن قرار پاتی ہے؟ شیخ نے فرمایا احیاناً معاً فرمایا حدیث اربعین سات طرق سے (یا گیارہ طرق سے) روایت کی گئی ہے تاہم محدثین وحفاظ نے اسے ضعیف ہی قرار دیا ہے۔

خامہ تلاشی میں جہاں مولانا منظر الاسلام ازہری سے نوک جھونک ہوئی ہے وہ خاصے کی چیز ہے، اہل علم نے اسے دلچسپی سے پڑھا، دونوں ازہری ہیں، علم حدیث میں تقریباً ہم ترازو ہیں لیکن یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

مَیں نے محسوس کیا کہ خامہ تلاش کا بے باک قلم کہیں کہیں مصلحت کا شکار ہو گیا اور خاموشی ہی میں اپنی عافیت سمجھی گئی، خاص طور پر ''برق وشرر کی تابشیں'' اور اس سے آگے پیچھے کے شماروں میں جو فنی ولسانی مباحثے ہوئے ہیں وہاں خامہ تلاش کا تبصرہ قارئین کے لیے مشعل راہ بنتا لیکن انہیں ''عافیت ساحل میں ہے'' یادرہا اور ''موج دریا کا حریف'' ہونا [ص:۳۹] یاد نہیں رہا، حالانکہ خامہ تلاشی کی ابتدا اسی شعر سے کی گئی تھی:

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ جام نور کے باذوق قارئین نے خامہ تلاشی کو دلچسپی سے پڑھا اور ایسے کالم کے لیے جام نور جیسے بلند معیار اور حقیقت پسند جریدے سے بہتر کوئی پلیٹ فارم ہو بھی نہیں سکتا تھا میرے نزدیک دونوں آنکھیں برابر ہیں

چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحث ناز پیچیدن
نگہ در نکتہ زائیہا نفس در سرمہ سائیہا

یہاں مَیں اپنے محسوسات پیش کر رہا ہوں، ضروری نہیں کہ قارئین اتفاق کریں۔ مجھے کب اور کن حالات میں یہ لکھنا پڑا تھا کہ ''اب خامہ تلاش کا انتقادی قلم علم سے زیادہ پندار علم کا ڈھنڈورچی ہو گیا ہے'' (ص:۱۶۲) میرا جملہ لفظ ''اب'' سے شروع ہوا تھا اور یہی لفظ میرے مفہوم کا بنیادی محور ہے خامہ تلاشی کا سلسلہ شروع ہوا اس کے مثبت نتائج آنے لگے، قلم احتیاط سے پکڑا جانے لگا، خامہ تلاش کی تلاش کسی مجرم کی تلاش نہیں تھی، کھل کر خراج عقیدت پیش کرنے والے اپنے ممدوح سے واقف ہونا چاہتے تھے، ان میں سے کچھ براہِ راست استفادہ کرنا چاہتے

تھے، سلسلہ آگے بڑھتا گیا، علم اپنی پوری تمکنت کے ساتھ اپنے فیوض لٹاتا رہا، دیگر قارئین کی طرح مَیں بھی مستفید ہوتا رہا مگر ایک وقت وہ آیا جب مَیں نے محسوس کیا کہ مداحی نے خامہ تلاش کو رفعت کی سطح مرتفع تک پہنچا دیا ہے، اب آگے بلندی کا کوئی تصور نہیں ہے، اس احساس کے ساتھ جب مَیں نے اس سلسلے کے موقوف ہونے سے پہلے کے چند شمارے پڑھے تو ایسا لگا کہ علم کے متوازی پندارِ علم کا خط نمایاں ہو گیا ہے، جو کبھی کبھی علم پر سبقت لے جاتا ہے۔ میری فہم ناقص میں یہ بات گھر کر گئی اور مَیں متذکرہ بالا جملہ لکھنے پر مجبور ہوا، یہاں مَیں بات نہیں بڑھانا چاہتا لیکن اپنی صفائی کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں:

> ''پس منظر و پیش منظر'' میں مولانا اسید الحق صاحب کا مضمون ''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ'' شایع کیا گیا ہے۔ یہ مضمون کی پہلی قسط ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ مضمون بھی طویل ہے۔ اس کی ساری قسطوں کا مطالعہ کیے بغیر اس مضمون پر کوئی تبصرہ کرنا قبل از وقت ہوگا۔ مضمون میں ایک جگہ ''قفس'' کو ص سے (قفص) لکھا گیا ہے، غالباً یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے یا ممکن ہے کہ مصر میں قفس ''ص'' سے ہی لکھا جاتا ہو ویسے ہماری ناقص معلومات کی حد تک اردو میں قفس ''س'' سے لکھا جاتا ہے۔ (فیروز اللغات)

مولانا اسید نے اپنے مضمون میں قفس کو ص سے قفص لکھ دیا ہے، اس پر معینی صاحب (یعنی خود اسید صاحب) لکھتے ہیں کہ ''غالباً یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے یا ممکن ہے مصر میں قفص ص سے ہی لکھا جاتا ہو''۔ عام قارئین جام نور کو معلوم ہو کہ نہ صرف مصر میں بلکہ دنیائے عرب میں قفص صاد سے ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ خامہ تلاش نے پچھلے شماروں کی خامہ تلاشی میں کئی جگہ لغات کشوری کا حوالہ دیا ہے، قفس کے تعلق سے لغات کشوری میں مرقوم ہے: ''قفس/قفص پرندوں کا پنجرہ، یہ لفظ سین اور صاد دونوں سے آیا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ فارسی میں تو سین اور صاد دونوں سے آتا ہے اور عربی میں فقط صاد ہے''۔ اگر اس اقتباس سے میرے متذکرہ بالا قول کی تائید نہیں ہوتی تو آگے

حد ادب۔

جیسا کہ پچھلی سطور میں کہا جا چکا ہے کہ خامہ تلاشی نے شؔرر مصباحی کو بھی اپنی نوازشوں سے محروم نہیں رکھا، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے:

''بریلی سے مولانا صغیر احمد صاحب اچانک اپنی تشویش لیے ہوئے نمودار ہوئے ہیں، عالم تصورات میں ہماری ملاقات مولانا سے ہوئی تو انہوں نے ہماری توجہ محترم شؔرر صاحب کے اس مکتوب کی طرف کرائی جو محترم نے حضرت اشرف میاں کو تحریر فرمایا ہے۔ مولانا صغیر احمد صاحب نے ہم سے استفسار کیا کہ شؔرر صاحب نے اس میں ایک جگہ لفظ ''تا ہنوز'' استعمال کیا ہے، اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟ چونکہ یہ از قسم استفسار تھا اس لیے ہم نے اس لفظ پر غور کیا اور ہنوز کر رہے ہیں اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک غیاث اللغات کی یہ عبارت ہماری سمجھ میں نہیں آجاتی ''ہنوز بفتح اول و ضم نون و وائے معروف بمعنی تا حال و تا اکنوں و کسانے کہ تا ہنوز بزیادت تا گویند غلط است''۔ (ص: ۱۲۸، ۱۲۹)

اس کا اعادہ یوں کیا گیا ہے:

'''' تا ہنوز' چونکہ خالص علمی مسئلہ ہے اس لیے تا ہنوز تشنۂ تحقیق ہے'' (ص: ۱۴۰)

اس کا الزامی جواب (جس کا تعلق ''عالم تصورات'' کے افسانے سے ہے) جام نور کے ذریعے حاضر کیا جا چکا ہے۔ تحقیقی و تفصیلی جواب کا وعدہ کیا گیا تھا، آج وہ قرض بھی ادا کیا جاتا ہے۔ [ص: ۴۰]

ایک مولانا غیاث الدین رام پوری نے نہیں بلکہ ان کے بعد کئی لغت نویسوں نے بھی تا ہنوز بزیادت تا کو غلط بتایا ہے، لغات کشوری میں ہے ''ہنوز بمعنی تا حال ابھی تک اور تا ہنوز محض غلط'' مرتب نے از راہ دیانت اپنی لغات کی جمع و ترتیب میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان میں غیاث اللغات بھی ہے۔ منؔیر لکھنوی نے اپنی کتاب ''صحت الفاظ'' میں تا ہنوز کو خواندہ اصحاب کا سہو کہا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ جب بعض کتب لغت میں یہ لفظ مذکور ہے اس کو غلط کہا گیا

ہے اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ اس لفظ کا استعمال پڑھے لکھے لوگ کرتے رہے ہیں ورنہ صرف ''ہنوز'' کے معنی بتا دیے جاتے۔ جو لوگ تا کو غیر ضروری اضافہ قرار دیتے ہیں یا بے معنی اضافہ کہتے ہیں انہیں منزل گہ پر بھی معترض ہونا چاہیے کہ منزل خود اسم ظرف ہے اس میں ''گاہ'' یا ''گہہ'' کی زیادت چہ معنیٰ دارد؟

کس ندانست کہ منزل گہ عشاق کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

اسی لغت کشوری میں ''متلاشی'' کے تحت ہے ''پریشان، معدوم، خراب ماخوذ لاشے سے اور بمعنیٰ تلاش کرنے والے کے محض غلط ہے'' یہاں بھی واضح ہے کہ متلاشی کا استعمال خواندہ حضرات کرتے آئے ہیں، اس لیے اس کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہوئی مگر کیا متلاشی بمعنی ''تلاش کرنے والا'' کا استعمال رائج نہیں ہے؟ اہل علم میں شایع و ذایع نہیں ہے؟ نتیجہ ظاہر کہ جو لفظ جس مفہوم میں اہلِ علم کے مابین شایع و ذایع ہو جائے وہ عرفاً صحیح ہے۔ اس کے علاوہ ہنوز اور تا ہنوز میں اطلاق کے اعتبار سے تھوڑا سا فرق معلوم ہوتا ہے مثلاً ''ہنوز دلی دور است'' یہاں ہنوز ہی برمحل ہے لیکن درج ذیل عبارت میں:

وآں رسالہ قبر بہ بود بہ سبب آنکہ در قبرش بود تا زمان مامون رشید ہیچ کس را معلوم نشد، در وقت مامون رشید بدست اور سید و بموجب حکم او حنین ابن اسحاق کہ طبیبے است کامل صاحب مذہب از زبان یونانی بہ عربی نقل نمودہ و آں رسالہ مشتمل برفوائد غریبہ و نکات عجیبہ بود تا ہنوز در ریمش از صدف بیروں نہ آمدہ و از زبان عربی بہ لسان فارسی ترجمہ نشدہ (ریاض الادویہ، ص:۱۰۳، مطبوعہ مصطفائی ۱۲۷۲ھ)

تا ہنوز ہی برمحل لگتا ہے۔ اسی لیے اردو لغات میں اس کے دو ترجمے دیے گئے ہیں (۱) ابھی (۲) ابھی تک۔ اور سو بات کی ایک بات حضرت امیر خسرو کے کلام میں بھی تا ہنوز موجود ہے:

خسرو اگر می سوزدت از حامیش رنجہ مشو
بسیار باید تا ہنوز آں شوخ ناداں در رسد
(تحفۃ الصغر، ص:۱۰۴)

خامہ تلاش کے اعتراض کی بنیاد مولانا غیاث الدین کی ''غیاث اللغات'' ہے، اب ذرا غیاث اللغات اور ملا غیاث کے بارے میں مرزا غالبؔ کے خیالات بھی ملاحظہ ہوں:

(۱) غیاث اللغات'' ایک نام مؤقر و معزز جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی آپ جانتے ہیں یہ کون ہے؟ ایک معلم فرومایہ، رام پور کا رہنے والا، فارسی سے نا آشنائے محض اور صرف ونحو میں ناتمام ''انشائے خلیفہ ومنشآت مادھورام'' کا پڑھانے والا۔ (اردوئے معلیٰ، ص: ۵۱۵، حصہ اول، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور)

(۲) یہاں تک کہ قتیلؔ نومسلم لکھنوی اور ملا غیاث الدین ملائے مکتب دار رام پوری اور کوئی روشن علی جونپوری اور کہاں تک کہوں کون کون......جس کے جی میں آئی متصدی تحریر قواعد انشا ہو گیا۔ (اردوئے معلیٰ، ص: ۱۱۳، حصہ دوم، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور طبع اول ۱۹۷۰ء)

(۳) اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیلؔ علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا۔ (عود ہندی، ص: ۵۶، طبع اول ۱۹۷۶ء، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور)

(۴) غیاث الدین رام پور میں ایک ملائے مکتبی تھا ناقل ناعاقل، جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیلؔ کا کلام، اس کا فن لغت میں کیا فرجام۔ (عود ہندی، ص: ۴۰۵، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور)

تتمہ: فاضل گرامی مولانا اسید الحق عثمانی (ابوالفیض معینی) کی تحریریں نہ صرف ہند و پاک میں بلکہ جہاں جہاں تک مؤقر جام نور کی رسائی ہے، بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس جریدے کا تفرد یہ ہے کہ نہ صرف اپنی جماعت کے عوام وخواص میں یہ مقبول ہے بلکہ ہر مکتب فکر کے اہل دانش اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے خامہ تلاشی میں وارد شدہ دو لفظوں کے تلفظ واملا کی طرف موصوف کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں تا کہ کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہ مل سکے:

(الف) ''معنیٰ'' یہ عربی زبان کا لفظ ہے، بیشک اس کا تلفظ اور املا معنیٰ الف مقصورہ سے ہے قاعدہ

بھی اسی کا متقاضی ہے، فارسی میں اس لفظ کے معنی تو وہی باقی رہے لیکن ہیئت بدل گئی یعنی معنیٰ سے [ص:۴۱] معنی بروزن یعنی ہو گیا (بطور شذوذ ہوتو ہو) اور اردو میں بصورت مفرد یعنی بغیر اضافت بصورت جمع استعمال کیا جانے لگا، فصحا کی تحریروں میں یوں لکھا دیکھا جاتا ہے ''اس کے معنیٰ یہ ہیں''۔ ''عالم کے معنی دنیا کے ہیں'' وغیرہ۔ شبلیؔ، حالیؔ، مولانا آزادؔ کی تحریروں میں جا بجا دیکھا جاسکتا ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے:

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا

''اس کا معنی یہ ہے''، ''عالم کا معنی دنیا ہے'' یہ خالص مولوی حضرات بولتے ہیں۔ معاون الشعرا میں ناسخؔ کے درج ذیل شعر میں معنیٰ الف مقصورہ سے لکھا ہوا ہے، جو غلط ہے اور اس غلطی پر شعر خود شاہد ہے:

معنی یہ ہیں کہ باغ میں ہم میکشی کریں
جنت میں گر شراب خدا نے حلال کی

ہاں جہاں عربی ترکیب میں واقع ہوگا وہاں عربی کا قاعدہ جاری ہوگا جیسے توجیہ المعنٰی۔ صدر الشریعہ نے فاضل بریلوی سے سوداؔ کے اس شعر کا مطلب پوچھا:

ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

فاضل بریلوی نے جو جواب املا کرایا اس کے دو جملے یہ ہیں (۱) ''شاعر کہ مذہباً سنی نہ تھا اور بدگمانی تمغائے شعرا ہے غالباً اس سے زائد کچھ نہ سمجھا ہوگا اور یہ ایک بیہودہ معنی تھے''۔ (۲) اب معنی واضح ہو گئے کہ جو کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمان بلکہ جزوِ ایمان ہے''۔ (الملفوظ حصہ اول، ص:۳۱)

نیز:

یہ شہ کی تواضع کا تقاضا ہی نہیں
تصویر کھنچے ان کو گوارا ہی نہیں

معنی ہیں یہ مانی کہ کرم کیا جانے
کھنچنا تو یہاں کسی سے ٹھہرا ہی نہیں

(ب) ''معرکۃ الآرا'' شاید ''معرکہ'' اور ''آرا'' دونوں کو عربی زبان کا لفظ سمجھ کر الف لام سے جوڑ دیا گیا ہے جب کہ ''معرکہ'' عربی اور ''آرا'' فارسی ہے اس کے بارے میں بدایوں شریف کے مولانا ابر احسنی کی ''میری اصلاحیں حصہ دوم'' کی درج ذیل عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

> عربی طریقے پر ''ال'' اتصالی یا اضافی، ایک فارسی اور ایک عربی لفظ کے درمیان نہیں آ سکتا جیسے ''معرکۃ الارا'' اس میں معرکہ عربی ہے ''آرا'' آراستن فارسی مصدر سے سنوارنے کے معنی میں ہے، معنی یہ ہوئے کہ معرکہ کو سنوارنے والا یہ ترکیب غلط ہے۔ ''معرکہ آرا'' ہونا چاہیے (ص: ۹۵) [ص:۴۲]

(ماہنامہ جام نور دہلی، شمارہ مارچ ۲۰۱۱ء، ص ۳۸ تا ۴۲)

☆☆☆

www.Qadri.i

ارباب علم ودانش

کے

# تاثرات

☆

## امین ملت حضرت سید امین میاں قادری برکاتی

(خانقاہِ برکاتیہ، بڑی سرکار، مارہرہ مطہرہ)

اپنے اکابر علما اور مشائخ عظام کی تصنیفات کی دوبارہ اشاعت جدید پیرایہ کے ساتھ کرنے کی سعی عزیزی مولانا اسید الحق قادری صاحب کر رہے ہیں اور یہ بڑی سعادت مندی کی بات ہے کہ انہوں نے اب تک تقریباً ۸۰ر کتابیں اپنے خاندانی بزرگوں اور مشائخ کی شایع کی ہیں اور مستقبل میں بھی ان سے بہت سے تخلیقی اور تحقیقی کاموں کی توقعات ہیں۔

(تحقیق التراویح: حضرت شاہ ابوالحسین احمد نوری،ص:۱۱، ناشر تاج الفحول اکیڈمی،۲۰۱۲ء)

☆☆☆

☆

## شرف ملت حضرت سید محمد اشرف قادری برکاتی

(خانقاہِ برکاتیہ، بڑی سرکار، مارہرہ مطہرہ)

آزادی کے بعد کے دور میں مذہبی صحافت میں تنقید وتبصرے کی روایت تو یقیناً ملتی ہے لیکن جامِ نور کے صفحات میں مستقل کالم کے طور پر عزیز گرامی قدر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کی ''خامہ تلاشی'' نے قارئین کے دل میں جیسی جگہ بنائی، اس کی مثال عنقا ہے۔ ''تجلی'' کے کالم ''مسجد سے میخانے تک'' کا موازنہ بے سود ہے کہ اس کالم میں قاری کے لیے دلچسپی کا سبب وہ عناصر تھے جنھیں سنجیدہ اور متین ادب میں احسن نہیں تصور کیا جاتا، مثلاً شخصی حملے، ذاتی عناد، برہمی اور پھکڑ پن۔

''خامہ تلاشی'' کے قبول عام میں جن عناصر نے حصہ لیا وہ ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہیں۔ گہرا علم، وسیع معلومات، سخن فہمی، عمدہ نثر کا استعمال، صحت زبان، منطقی طریقۂ کار، طنز کا

شائستہ انداز، ظریفانہ ذوق، بے باکی (گستاخی نہیں)، احساس توازن، پاس اعتدال، ''خیال خاطرِ احباب'' اور......ظرف نگاہ۔ یہ آخری بات کسی کسی کونصیب ہوتی ہے۔ سنجیدہ، متین اور علمی تحریر کے اُفق پر ظرافت کی رو پہلی چمک نے ان کالموں کو یادگار بنا دیا ہے۔

مندرجہ بالا عناصر کہیں یکجا ہو بھی جائیں تب بھی بات نہیں بنتی جب تک سینے میں آگ نہ روشن ہو۔ جذبے کی یہی گرمی تو ایسے جاندار اور معنی خیز الفاظ بنتی ہے جو ہمیں اس تحریر میں نظر آتے ہیں جو سید شمیم گوہر کے تبصرے پر راجہ رشید محمود کی برہمی کے جواب کے طور پر معرضِ وجود میں آئی۔

مدیر جامِ نور مولانا خوشتر نورانی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کے پیہم اصرار پر فاضل مصنف نے یہ کالم سپرِدِ قلم کیے جواب ہماری مذہبی صحافتی تاریخ کا خوبصورت اور بامعنی حصہ ہیں۔

ان دلکش تحریروں کے مصنف خانقاہ قادریہ، بدایوں شریف کے فرزند جلیل مولانا اسید الحق قادری کے لیے بے شمار دعائیں کہ ابھی انھیں بہت سے چراغ روشن کرنا ہیں۔

(فلیپ: خامہ تلاشی، مؤلف ابوالفیض معینی، ناشر تاج الفحول اکیڈمی، دسمبر ۲۰۰۹ء)

☆☆☆

☆

عزیز گرامی قدر مولانا اسید الحق قادری نے ان رسائل کو بڑے عمدہ انداز میں ترتیب دیا ہے، تخریج و تسہیل مناسب مقامات پر اردو ترجمہ اور ہر رسالے کے پس منظر کا بیان، دیکھا جائے تو ایک مستقل کتاب لکھنے سے زیادہ محنت ان رسائل کی موجودہ ترتیب میں صرف ہوئی ہوگی۔ فاضل مرتب کا یہ پہلا کام نہیں ہے۔ وہ اپنے اجداد اور دیگر خاندانی بزرگوں کی پچاس سے زیادہ کتابوں، رسائل کو جدید اندازِ نگارش کے ساتھ شائع کرنے کا کارنامہ انجام دے چکے ہیں جن کی یکجا رونمائی بدایوں شریف میں عرس قادری کے موقع پر ہوئی جسے ہزاروں کے مجمع نے دیکھا۔

(تقریظ مجموعہ رسائل فضل رسول، مرتبہ مولانا اسید الحق قادری، ص ۸، رضا اکیڈمی ممبئی، ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

(برکات اکیڈمی، کراچی)

آپ نے ''خیر آبادیات'' لکھ کر ایک موضوع اختراع فرمایا ہے، اور بہت سے گم نام، کم نام اور نام و شہرت سے بے نیاز بلکہ گریزاں فضلا کے محاسن کردار کے نادر اور مستند واقعات کو ترتیب دے کر ایک گل دستہ بنا دیا ہے، مَیں نے کئی باذوق حضرات کو مطالعے کے لیے دی، وہ بہت متأثر ہوئے۔ ہمارے اکابر کی علم دوستی، طالب علم دوستی، کتاب دوستی اور طلبہ پر شفقت وغیرہ نے بہت متأثر کیا۔

اندازہ ہوا کہ خیر آبادیات کا مرکز اب ٹونک، رامپور وغیرہ سے بدایوں منتقل ہوگیا ہے اور آپ جیسے جواں سال اور جواں بخت حضرات کی رہنمائی میں یہ کاروان فضل و کمال دوبارہ سرگرم سفر ہوگا۔ میری طرف سے والد ماجد مدظلہ سے سلام پہنچا دیں اور دعا کی درخواست۔

چند معروضات پیش کرر ہا ہوں۔

(۱) حسرت العلما بوفاۃ شمس العلما: انشاء اللہ پیش خدمت کرر ہا ہوں، یہ دراصل استاذ علامہ کا مرثیہ ہے اور چند صفحے کا ایک رسالہ ہے جو حاشیہ قاضی از مولانا عبدالحق کے آخر میں شائع ہوا تھا، استاذ کا حاشیہ قاضی جدامجد نے اپنے صرف سے چھپوایا تھا۔

(۲) حضرت مولانا مفتی عبدالقدیر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری کا صحیح واقعہ یہ ہے: ۱۹۵۸ء میں حضرت کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، مَیں اور برادر مکرم مولانا حکیم نصیر الدین ندوی (نظامی دواخانہ کراچی) حاضر ہوئے اور سلام اور مصافحہ کے بعد جب حکیم صاحب مرحوم نے میرا تعارف کروایا تو مولانا نے خدام کو اشارہ کیا تو انہوں نے مولانا کو کھڑا ہونے میں مدد کی، مجھے محسوس ہوا کہ یہ میرے لیے زحمت فرمائی گئی ہے تو درخواست کی کہ آپ تشریف رکھیں، مولانا نے بیٹھ کر بہت دیر تک باتیں کیں اور ٹونک میں قیام کے کئی واقعات سنائے اور فاضل بریلوی سے اپنی ملاقات کا واقعہ بھی سنایا کہ جب مَیں نے بتایا کہ معقولات کی تحصیل ٹونک میں مولانا برکات احمد سے کرر ہا ہوں تو مولانا بریلوی نے فرمایا کہ ہم تو معقولات کو طلاق دے چکے ہیں، اس پر مَیں

نے عرض کیا کہ اب اس کا حلالہ ٹونک میں ہو رہا ہے۔
(۳) مولانا فضل امام کی کتاب تشحیذ الاذہان غیر مطبوعہ نہیں ہے، مطبع غالب الاخبار سیتا پور میں ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئی تھی، اس کا ایک قلمی نسخہ بھی میرے پاس ہے جو میرے والد ماجد مولانا حکیم سید محمد احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔
(۴) مولانا فضل امام کی ایک کتاب ترجمہ تاریخ یمنی خود مولانا فضل امام کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے ذخیرے میں ہے۔
(۵) مولانا عبدالسلام مرحوم نے مناظرۂ رامپور کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، انہوں نے مولانا فضل حق رامپوری مرحوم کے بیان پر لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بیان نصف صدی سے زیادہ عرصے کے بعد قلم بند کیا گیا ہے، ضروری نہیں کہ پوری طرح یاد رہا ہو، مناظرے کی جو روداد صرف ایک ہفتے کے بعد ریاست کے سرکاری اخبار دبدبہ سکندری میں ۲۴؍جولائی ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی وہ میرے سامنے ہے اور مولانا عبدالسلام یا مولانا فضل حق رامپوری کے بیان سے مختلف ہے، مَیں دبدبہ سکندری کی شائع شدہ روداد کا مصورہ ارسال کر رہا ہوں۔
یہ عریضہ خود لکھ رہا ہوں، پتہ نہیں یہ تحریر آپ کے لیے مایقرء بھی ہوگی کہ نہیں، اب تو خود مجھ سے اپنا لکھا نہیں پڑھا جاتا۔ (غیر مؤرخہ۔ موصولہ ۳۰؍دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ)

**الحمد لله رب العلمین والصلاة والسلام علی من لا نبی بعده**

انسانی زبان دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے، ایک پہلو عمومی ہوتا ہے جو اہل زبان کے تمام عامۃ الناس کے اختیار ہوتا ہے اور اہل زبان کے سب بولنے والوں میں ملتا ہے۔ دوسرا پہلو پڑھے لکھوں اور خواص کا ہوتا ہے جو فصیح اور غیر فصیح کے درمیان فرق کو سمجھتے ہیں اور بات کرنے میں اس کے لحاظ کی کوشش کرتے ہیں، اور جو لوگ زبان کے ماہر ہوتے ہیں وہ کنایے، استعارے اور محاوروں کو بھی سمجھتے ہیں کہ ان سے انسانی کلام میں تاثیر اور قوت پیدا ہوتی ہے اور ان سے بات کرنے والے کا تاثر اور کیفیت مؤثر انداز سے سامنے آتی ہے اور ان کے ذریعے ان کے اندر جو ذہنی اور جذباتی کیفیت ہوتی ہے اس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

یہ محاورے اور انہی کے ساتھ ساتھ استعارے اور کنایے جس زبان کے ہوتے ہیں، اس زبان کے ماحول اور اس کے بولنے والوں کی زندگی اور ان کے مخصوص حالات سے بنتے ہیں، دوسری زبان میں ان کا بجنسہٖ ترجمہ کرنا آسان نہیں ہوتا، ان کا سطحی ترجمہ تو ہوسکتا ہے لیکن جن حالات میں اور جن اشخاص کے مزاج کا اثر لیے ہوئے یہ محاورے بنے ہیں ان کے ترجمے میں پوری ادائیگی نہیں ہوتی۔ دوسری زبان میں ان کا وہ خاص اثر جو اس میں اپنی زبان کے مخصوص حالات میں پیدا ہوا، وہ سامنے نہیں آپاتا۔ اسی لیے جب ایک زبان سے دوسری زبان میں محاورے کو منتقل کیا جاتا ہے تو اس کا ترجمہ بجنسہٖ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ملتے جلتے مفہوم کے لیے دوسری زبان میں جو محاورہ ہوسکتا ہے اس سے بات کو کسی حد تک ادا کیا جاسکتا ہے، اس طرح اس مفہوم کی اگرچہ سو فیصدی ادائیگی نہیں ہوسکتی، لیکن ضرورت پوری کرنے کی حد تک ادائیگی ہو جاتی ہے۔

محترم جناب اسید الحق قادری صاحب نے عربی محاوروں کی اردو کے مماثل محاوروں میں ادائیگی خاصی حد تک کی ہے اور پیش نظر کتاب میں اچھی مثالیں پیش کی ہیں، اس سے دونوں

زبانوں کے محاورات سے اپنی فنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے اور اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو دونوں زبانوں کا اچھا ذوق حاصل ہے، اس کو دیکھتے ہوئے عربی اور اردو ادب کی تعلیم اور تعلم کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب قابل قدر ہوگئی ہے۔

مَیں مصنف کو ان کی زبان دانی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور قدر کا اظہار کرتا ہوں۔ امید ہے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کو قبول فرمائے (آمین) (مؤرخہ ۴/محرم ۱۴۳۳ھ/ ۳۰/نومبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

(ماہنامہ شب خون، ۳۱۳/۱۳، رانی منڈی، الٰہ آباد)

آپ کی کتاب ''عربی محاورات مع ترجمہ وتعبیرات'' ملی، شکریہ۔ میں نے یہ کتاب جگہ جگہ سے دیکھی اور اسے بہت خوب پایا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب حوالے کے لیے سرہانے رکھی جانی چاہیے۔ آج کے نام نہاد زبان داں حضرات زبان کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں اس سے مایوسی ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ مستند روزمرہ اور محاورات کو محفوظ رکھا جائے۔ اس کتاب کا قیمتی حصہ یقیناً محاورات پر مبنی حصہ ہے۔ کتاب کا مقدمہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے اگرچہ بعض جگہ اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔

صفحہ ۱۴/ کے حاشیے پر آپ جن خاتون کا ذکر کر رہے ہیں ان کے نام کا صحیح انگریزی تلفظ SUSAN STETKEVYCH (سوزن اسٹیٹکی وچ) ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر مَیں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت کامیاب ہوگی۔ (مؤرخہ ۲۷/دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر سعید الاعظمی ندوی

(مدیر ماہنامہ البعث الاسلامی، لکھنؤ)

جناب کا ارسال فرمودہ ہدیۂ ثمینہ ''عربی محاورات مع ترجمہ وتعبیرات'' ملا۔ سب سے پہلے میں آپ کی اس بندہ نوازی کے لئے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے ذوق عربیت سے مجھے فائدہ پہنچایا۔ کتاب کے اکثر حصے کو بغور پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی توفیق ہوئی، مقام شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے قابل تعریف کام کرایا اور عربی محاورات کی تشریح وتطبیق کا ایک اچھا کام آپ نے کیا، یوں تو علم خواہ کسی زبان کا ہو اور خاص طور سے عربی زبان کا علم، تو ایک بحر زخار ہے، جس کے ساحل تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔

امید ہے کہ یہ سلسلہ آپ کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچے گا اور عربی زبان وادب کے حلقوں میں مفید اور مقبول ہوگا۔ (مؤرخہ ۲۴ر نومبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر مسعود انور علوی

(چیئر مین شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

کاکوری سے واپسی پر آپ کا فرستادہ تحفہ موصول ہوا۔ کرم گستری و یاد فرمائی کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ بڑا کام کر رہے ہیں۔ عنداللہ وعندالناس ماجور ہوں گے۔ حضرت والد صاحب قبلہ مدظلہ العالی کی خدمت عالیہ میں دست بستہ سلام ودعاؤں کی درخواست۔

(مؤرخہ ۱۲ر ستمبر ۲۰۰۸ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

(لکھنؤ)

یہ آپ کی شرافتِ نفس اور منظور نوازی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ نے اپنی دو گراں قدر تصانیف میرے پاس تبصرے کے لیے روانہ فرمائی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کی اس کرم فرمائی میں میرے استحقاق سے کہیں زیادہ آپ کی اردو دوستی اور منظور نوازی کے جذبات شامل ہیں۔

''عربی محاورات'' اور ''خیر آبادیات'' دونوں پر مَیں اپنی رائے لکھ بھیجوں گا۔ مکروہاتِ دنیا میں اتنا گرفتار ہوں کہ اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو معاف فرمایے گا۔

''علامہ تاج الفحول'' پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا (نعتیہ شاعری کے حوالے سے) ابھی میرے چند مضامین کا ایک مجموعہ ''شہر ادب'' کے نام سے شایع ہوا ہے۔ یہ مضمون اُس میں شامل ہے، جلد ہی روانہ کر دوں گا۔ (مؤرخہ ۷/دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## پیرزادہ اقبال احمد فاروقی

(مرکزی مجلس رضا، لاہور، پاکستان)

آپ کے کتابی تحفے ملے۔ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مگر جو ''خامہ تلاشی'' میں خوشبو ہے اسے دیکھ کر برملا کہنا پڑا ع

خوشبو ہے زمانے میں تری اے گلِ چیدہ

آپ کی علمی موضوعات پر ساری کتابیں پسند آئیں، بعض تو پاکستان میں چھپ گئیں، بعض گلِ تازہ بن کر آئیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ نے کرم فرمایا ورنہ محکمۂ ڈاک نے تو ہمیں ہندوستان کی کتابوں سے محروم کر دیا ہے۔ (مؤرخہ ۳۰/جنوری ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر سید امین اشرف

(سابق استاذ شعبہ انگریزی، اے.ایم.یو، بدر باغ علی گڑھ)

غالباً دو سال قبل کچھوچھہ شریف میں آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔نہایت متوازن، سنجیدہ اور کڑھی ہوئی شخصیت، خدا نے گویائی کے جوہر سے بھی مالا مال کیا ہے۔

مضمون (کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟) سبحان اللہ نہایت جامع اور بغایت ژرف نگاہی سے لکھا ہوا ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

دل سے شکر گزار ہوں مجلّہ ''آفتاب عالم'' کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(مؤرخہ ۳؍ستمبر ۲۰۰۷ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر محمد مصطفیٰ شریف

(صدر شعبہ عربی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد، دکن)

زیرِ نظر کتاب [عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات] ایک ایسے ہی عالم کے نوک قلم سے معرض وجود میں آئی ہے جو الحمدللہ بہ یک وقت دونوں زبانوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، مزید یہ کہ وہ صوفی بھی ہیں عالم بھی، ادیب بھی ہیں ناقد بھی، مترجم بھی ہیں مؤلف بھی، اور ماہر لسانیات بھی، اردو نے تو انہیں کے خانوادوں میں انگڑائیاں لی ہیں، عربی ادب کی آخری پناہ گاہ (جامع ازہر) میں ان کا قیام اور وہاں کے عبقری اساتذہ سے ان کا استفادہ اس پر مستزاد۔

مولانا موصوف سے میری پہلی ملاقات شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ میں ہوئی، نورانی متبسم چہرہ اور انداز تکلم ان کی خاندانی اور ذاتی علمی وجاہت کی گواہی دے رہا تھا، عربی زبان اور بالخصوص محاورات کے سلسلے میں ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف اسید الحق ہی نہیں بلکہ ''اسد الادب'' بھی ہیں اللھم زد فزد (تقریظ عربی محاورات: ص۱۴، تاج الفحول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## مولانا یاسین اختر مصباحی

(بانی وصدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی)

چشم و چراغِ خانوادۂ عثمانیہ بدایوں صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری بدایونی مرتب ''مجموعۂ رسائل فضلِ رسول'' ہماری پوری جماعت اہلِ سنت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے آباواجداد اور جماعتِ اہلِ سنت کے اکابر واسلاف کی کتب ورسائل کو بڑی محنت وعرق ریزی اور تحقیق وتخریج وتحشیہ وترجمہ کے ساتھ تاج الفحول اکیڈمی بدایوں کے ذریعے منظر عام پر لا رہے ہیں۔

عزیز موصوف علم وحلم، فکر وفہم اور اخلاقی محاسن کے اعتبار سے اپنے آباواجداد کے وارث وامین اور سچے جانشین ہیں۔ انہیں جو کام کرنا چاہیے اسے بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ان کے عزائم اور حوصلوں کی داد دی جانی چاہیے کہ وہ اس وقت خیر الخلف لخیر السلف ہیں۔

(مقدمہ مجموعہ رسائل فضل رسول، مرتبہ مولانا اسید الحق قادری، ص ۷۱، رضا اکیڈمی ممبئی، ۲۰۱۰ء)

☆

''خیرآبادیات'' بدایونی ''فریضہ'' اور خیرآبادی ''حق'' کی ادائیگی کا ایک باوقار روحانی و علمی امتزاج اور احسان شناسی کا پُرخلوص نمونہ ہے۔ ساتھ ہی دنیائے علم وتحقیق میں ''خیرآبادیات'' کے عنوان سے ایک وقیع تاریخی دستاویز کا اضافہ بھی، جس کی ترتیب وپیش کش کا اعزاز صاحب زادۂ عالی قدر عزیزِ گرامی مولانا اسید الحق قادری بدایونی کو حاصل ہے اور وہ اس اعزاز کے صحیح مستحق بھی ہیں۔ گویا۔ حق بحق دار رسید۔

زیرِ نظر کتاب ''خیرآبادیات'' ایک محققانہ، فاضلانہ اور مؤرخانہ دستاویز ہے جسے ہندو پاک کے اہلِ علم وفضل نہ صرف قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے بلکہ اسے خیرآبادیات کا ایک گراں قدر مجموعہ اور بیش قیمت مرقع قرار دیں گے۔

(تقریظ خیرآبادیات: از مولانا اسید الحق قادری، ص ۱۶، ناشر تاج الفحول اکیڈمی بدایوں ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم

(صدر شعبہ اردو، جامعہ ازہر، مصر)

یہ [عربی محاورات مع ترجمہ وتعبیرات] اپنی نوعیت کی نئی اور اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے، جس میں قابل قدر تعداد میں عربی محاورات جمع کر دیے گئے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ کہیں ان کا متبادل اردو محاورہ اور بعض جگہ ان کی تشریح کی گئی ہے، ان عربی محاورات کے ساتھ عربی جملے بھی دے دیے گئے ہیں جو ان محاورات کے استعمال کا طریقہ اور ان کا معنی مراد واضح کر رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بڑی اہم کتاب ہے، خاص کر ان غیر عرب لوگوں کے لیے جو عربی سیکھ رہے ہیں، غالباً اس سے پہلے کسی کو اس قسم کی کتاب کا خیال نہیں آیا، اگر چہ یہ مواد مختلف کتابوں اور مقالات میں بکھرا ہوا موجود تھا، لیکن ایک کتاب میں اس کو منظّم ومرتب شکل میں سلیقے سے جمع کرنا یقیناً ایسا کارنامہ ہے جس کے لیے مؤلف کی ستائش کی جانی چاہیے۔

یہ بھی میری سعادت ہی ہے کہ مجھے مؤلف کتاب برادر عزیز اسید الحق محمد عاصم قادری سے تعارف حاصل ہوا، جو اتر پردیش کے ایک شہر بدایوں سے نسبت رکھتے ہیں، اس شہر نے بے شمار علما، شعرا اور ادبا پیدا کیے ہیں جن پر برصغیر ہندو پاک کے لوگ بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اسید الحق بھی انہیں علما کی صف میں شامل ہوں گے۔ خاص کر جب کہ انہوں نے جامعہ ازہر شریف میں کلیہ اصول الدین کے شعبہ تفسیر سے فراغت حاصل کی ہے، اور پھر کامل ایک سال گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مصری دارالافتا سے اجازت افتا بھی حاصل کی ہے۔ (تقریظ عربی محاورات: ص:۹/۱۱، تاج الفحول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر عصام عید فہمی ابوغربیہ

(استاذ شعبہ نحو،صرف،عروض،کلیہ ''دارالعلوم'' جامعہ قاہرہ)

پیش نظر کتاب [عربی محاورات مع ترجمہ وتعبیرات] بڑی اہم اور مفید کتاب ہے،اس میں مؤلف نے بڑی تعداد میں عربی محاورات جمع کر دیے ہیں اور بڑی کامیابی سے ان کو اردو میں منتقل کیا ہے،یقیناً مؤلف نے بیش قیمت جواہر پیش کیے ہیں،ان محاورات کو جمع کرنے،ترتیب دینے،سمجھنے اور پھر ان کو اردو میں منتقل کرنے میں مؤلف نے بڑی محنت کی ہے،حالانکہ ترجمہ کرنے میں بڑی دشواریاں اور نزاکتیں ہوتی ہیں۔

مؤلف کتاب برادرم اسید الحق محمد عاصم قادری دارالافتا (قاہرہ) میں عربی زبان وادب کی تحصیل کے لیے میرے درس میں شریک ہوئے ہیں تاکہ فہم قرآن میں یہ معاون ہو سکے،میں جو کچھ نحو وصرف اور لغت وانشا کے درس دیا کرتا تھا اس سے انہوں نے بخوبی استفادہ کیا،یقیناً اس میں ہر اس شخص کے لیے عظیم فائدہ ہے جو علوم اسلامیہ کی درس وتدریس میں مشغول ہو۔

اسید الحق سے روابط وتعلقات کے دوران میں نے ان کے اندر علم نافع کی تحصیل کے لیے بڑا شوق وجذبہ دیکھا،یہی ان لوگوں کا طریقہ ہے جو علوم تفسیر،حدیث اور فقہ کو اس جذبے کے تحت حاصل کرتے ہیں کہ ان کی صلاحیتیں کامل ہوں،مطالعہ وسیع ہو اور غلطیاں کم ہوں۔(تقریظ عربی محاورات:ص:۱۲/۱۳،تاج الفحول اکیڈمی،۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر علیم اشرف جائسی

(شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

عزیز القدر مولانا اسید الحق نئی نسل کے نمائندہ عالم اور قلم کار ہیں جن کی تصنیفات میں قدیم صالح اور جدید نافع کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے، انہیں علمی و تحقیقی کاموں کا شوق بھی ہے اور سلیقہ بھی۔ اس سے پہلے بھی ان کی کئی علمی کاوشیں منظر عام پر آ کر اہل علم سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ فکر میں اصالت، پیشکش میں عصریت اور اصول تحقیق کی رعایت کے ساتھ ساتھ زبان کی سلاست ان کی تحریر کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ''عربی محاورات'' ان کے اشہب قلم کا نیا پڑاؤ ہے اور اس بار اس نے بے حد سنگلاخ اور پُرخطر زمین پر دوڑ لگائی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ کام اپنے موضوع پر حرف آخر ہے بلکہ اس موضوع پر اور شاید زبان و ادب کے کسی بھی موضوع پر حرف آخر کی گنجائش ہی نہیں ہوتی ہے، لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ اب تک کا سب سے جامع اور تحقیقی کام ہے۔

احمد فارس شدیاق نے سعد اللہ مراد آبادی کی کتاب ''القول المانوس فی صفات القاموس'' کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر یہ کتاب مجھے اپنی تصنیف ''الجاسوس علی القاموس'' کی اشاعت سے پہلے مل جاتی تو اسے بعینہٖ اس میں شامل کر لیتا۔ میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اسید الحق صاحب کا یہ شاہکار میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''اردو زبان و ادب پر عربی کے اثرات'' سے پہلے منصۂ شہود پر آیا ہوتا میں اپنے مقالے میں کم از کم ایک فصل کا اضافہ ضرور کرتا۔

یہ کتاب مقارناتی ادب کے مطالعے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس سے عربی اور اردو زبان کے طلبہ اور اسکالرز یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں علاوہ ازیں یہ عربی اردو ترجمہ کرنے والوں کے لیے بھی بے حد مفید ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب جلد ہی عربی شعبوں کی سفارش کردہ کتابوں کی فہرست میں نظر آئے گی۔

(فلیپ عربی محاورات: تاج الفحول اکیڈمی، ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## مولانا سید رکن الدین اصدق

(مدرسہ اصدقیہ مخدوم شریف، پکی تالاب، بہار شریف)

کتاب ''احقاقِ حق'' دستیاب ہوئی۔ یاد آوری کا شکریہ۔ اپنے بزرگوں کی علمی اور دینی خدمات سے دنیا کو متعارف کرانے کی کامیاب کوشش ہے۔مولیٰ تعالیٰ آپ کے علم وعمر میں برکتیں عطا فرمائے اور آپ کی اس قیمتی کاوش کو نفع خلق کا سامان بنائے۔

احقاق حق پر تبصرہ جام شہود کے اگلے شمارے میں انشاء اللہ ضرور آ جائے گا۔ دعا ہے کہ مولائے قدیر آپ کی ذات سے ایک بار پھر بدایوں شریف کو لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا دے۔(مؤرخہ ۱۴؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ)

☆☆☆

☆

## مولانا محمد وثیق ندوی

(استاذ کلیۃ اللغۃ العربیۃ و آدابھا دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ)

باعث تحریر یہ ہے کہ استاذی وشیخی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (حفظہ اللہ ورعاہ) ناظم ندوۃ العلما کے پاس مَیں نے آپ کی شاہ کار تصنیف ''عربی محاورات'' دیکھی جو اپنے موضوع پر بڑی وقیع اور پر از معلومات ہے، حضرت نے بھی آپ کی کتاب کو سراہا ہے اور مقدمہ املا کرانے کے دوران مجھ سے کئی بار فرمایا کہ ''یہ کتاب شائقین عربی زبان وادب کے لیے بڑی مفید ہے''، اس لیے خیال ہوا کہ اگر اس اہم اور مفید کتاب کے چند نسخے اور آ جائیں تو اساتذہ اور طلبہ کے لیے استفادہ آسان ہو جائے گا اور حضرت کا بھی یہی خیال ہے۔

لہٰذا اگر آپ اپنی شاہکار تصنیف کے دو تین نسخے اور بھیج دیں تو بڑی عنایت ہوگی اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔(مؤرخہ ۱۶؍محرم ۱۴۳۳ھ/۱۲؍دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## مولانا محمد کوثر خاں نعیمی

(جامعہ عربیہ اظہار العلوم، جہانگیر گنج، امبیڈکر نگر)

خدائے قدیر حی و قیوم آپ کو سلامت رکھے، آپ کی تحقیق اور قوم و ملت کی اصلاح کے لیے وقیع مضامین کو امت مسلمہ کے لیے اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ آپ کے خلوص وللّٰہیت وانکساری کو آپ کی ترقی کا ذریعہ بنا کر فیضان عام وتام فرمائے۔ آمین آمین بجاہ حبیبہ الکریم علیہ والہ افضل الصلوٰۃ وازکی التسلیم۔

آپ کے وسیع مطالعے سے دل کو خوشی ہوتی ہے، رب قدیر نمونۂ اسلاف بنا کر خدمات دین کو قبول فرمائے۔ (مؤرخہ ۲۵ر ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ)

(افسوس ۲۰ر ربیع الاول ۱۴۳۳ھ/ ۱۳ر فروری ۲۰۱۲ء کو مولانا نعیمی کی وفات ہوئی، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔ مرتب)

☆☆☆

☆

## پروفیسر سید حنیف احمد نقوی

(سابق صدر شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس)

قیامِ بدایوں کے دوران آپ کی بھجوائی ہوئی کتابیں مل گئی تھیں۔ اس عنایتِ خاص کے لیے ممنون ہوں۔ رفتہ رفتہ سبھی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جی خوش ہوا کہ آپ بدایوں کی علمی روایت کو از سرِ نو زندہ کرنے میں مصروف ہیں، ورنہ عرصے سے اس قسم کے موضوعات پر کتابوں کی تصنیف و اشاعت کا سلسلہ بند تھا۔ مذہبیات سے میری دلچسپی صرف مطالعے تک محدود ہے، اس لیے ان کتابوں کے بارے میں کسی قسم کے اظہارِ خیال کو مناسب نہیں سمجھتا، تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ قدیم نزاعات سے صرفِ نظر کر کے اگر مثبت انداز میں کچھ کام کیا جائے تو وہ زیادہ مفید و کارآمد ہوگا۔ منطق وفلسفے کی گرم بازاری اور اس میدان میں ہمارے محترم بزرگوں کی باہمی معرکہ آرائیوں نے ہمیں فائدہ کم نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔ آپ کی یہ خوبی مجھے پسند آئی کہ آپ نے اپنی

تحریروں میں فریقین کے ذکر میں بڑی حد تک حفظِ مراتب کوملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے، یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔

اب ایک دو واقعات اور چند لسانی و بیانی مسائل کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں:

☆ آپ نے ''خیر آبادیات'' کے صفحہ نمبر ۱۳۳ر پر دہلی میں دو دانشمندوں کے درمیان مباحثہ و مناظرہ کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے کہ'' علامہ فضل حق اس زمانے (۱۲۷۳ھ) میں دہلی میں نہیں تھے، الور میں بہ سلسلۂ ملازمت قیام پذیر تھے''۔ یہ اطلاع صحیح نہیں۔ اس مباحثے کے اولین راوی مرزا غالبؔ ہیں، انہوں نے سلطان العلما مولوی سید محمد کو جس خط کے ذریعے اس کی اطلاع دی تھی وہ ۲۱ر جمادی الاولیٰ ۱۲۷۳ھ (۱۷ر جنوری ۱۸۵۷ء) کو لکھا گیا تھا۔ غالبؔ ہی کے ایک خط موسومہ نواب یوسف علی خاں مورخہ ۵ر فروری ۱۸۵۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت علامہ فضل حق رام پور میں موجود تھے اور تمام ظاہری قرائن اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ موصوف نے الور سے رام پور کا یہ سفر براہِ دہلی طے کیا تھا، اس لیے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان دو دانشمندوں میں سے ایک علامۂ موصوف ہی تھے۔

☆ ''خامہ تلاشی'' کے صفحہ نمبر ۴۹ پر آپ نے جوشؔ کی خودنوشت کا نام ''یادوں کی بارات'' تحریر فرمایا ہے۔ صحیح نام ''یادوں کی برات'' ہے۔ ''بارات'' یوں بھی غلط ہے۔ حالیؔ کے ''مرثیۂ غالب'' کا مشہور مصرع ہے: ''خواجہ نوشہ کا اور شہر برات''

**''خامہ تلاشی'' ہی سے متعلق کچھ اور معروضات:**

☆ آپ نے ''سن'' کو ہر جگہ مونث لکھا ہے۔ کوئی اور صاحب کبھی آپ کو اس طرف متوجہ کر چکے ہیں کہ یہ مونث نہیں مذکر ہے۔ چونکہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسے ''سن'' لکھا جائے یا ''سنہ''۔ اس لیے میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ مرکبات (مثلاً سن ولادت، سنِ وفات) کی صورت میں ''سالِ ولادت'' یا ''سالِ وفات'' کو ترجیح دی جائے۔ ''سِن'' اردو میں ''عمر'' کے معنی میں مستعمل ہے (برس پندرہ یا کہ چودہ کا سِن) ''سال'' کے لیے عموماً ''سنہ'' استعمال ہوتا ہے۔ ''سال'' کے سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ جہاں اسے بہ صیغۂ جمع استعمال کا موقع ہو، وہاں ''سالوں'' کی بجائے ''برسوں'' لکھا جائے۔

☆صفحہ۶۱ ر پر ''اس بار'' اور ''اس مرتبہ'' دونوں ایک ہی جملے میں جمع ہیں، یہ تکرار غیر ضروری بھی ہے اور نامطبوع بھی۔

☆صفحہ۶۱ ر ''الیمپے کی طرف......روشنی ڈالی گئی ہے''۔الیمپے پر......روشنی ڈالی گئی ہے۔ایسے مواقع پر الفاظ کا امالہ بھی ضروری ہے۔

☆صفحہ۶۲ ر ''رندِ بادہ خوار......رند اور بادہ خوار دونوں کا ایک ہی معنی ہے''، یہ خیال صحیح نہیں۔ ''رند'' کے لغوی معنی ''منکر'' ہیں۔مجازاً یہ ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو تمام مذہبی قیود اور سماجی بندشوں سے آزاد ہو۔اس اعتبار سے ''رندِ بادہ خوار'' کی ترکیب بالکل درست ہے۔سند کے لیے آزردہ (مفتی صاحب مرحوم) کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

کامل اس فرقۂ زہّاد سے اٹّھا نہ کوئی　　　　کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

☆صفحہ۸۴ ر ''غیض وغضب''، پہلے لفظ کا صحیح املا ''غیظ'' ہے۔''غیض'' کے معنی ہیں پانی کا کم ہونا۔

☆صفحہ۸۵ ر ''جناب فردوسی صاحب''، ''جناب'' اور ''صاحب'' کا یہ اجماع ہم اردو والوں کے نزدیک خلافِ قاعدہ ہے۔یا ''جناب'' لکھیے یا ''صاحب''۔

☆صفحہ۱۲۳ ر ''پہو نچے''، املا کی یہ شکل اس زمانے کی یادگار ہے جب اعراب بالحروف کا قاعدہ رائج تھا اور ''اُس'' اور ''اُن'' کو ''اوس'' اور ''اون'' لکھا جاتا تھا موجودہ روش املا کے مطابق ''پہنچے'' لکھنا چاہیے۔

☆صفحہ۱۳۹ ر ''سنبھل کر رکھنا قدم دشتِ خار میں مجنوں ☆ کہ اس نواح میں سودؔا برہنہ پا بھی ہے'' مصرعِ اول کا صحیح متن: ''سنبھل کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں''۔

☆صفحہ۱۹۰ ر ''مجھ سے وہ چھپ سکیں بھلا ایسے کہاں کے ہیں-جلوے مری نگاہ میں کون ومکاں کے ہیں'' پہلے مصرعے کا متن: ''مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں''۔

☆''مفتی لطفؔ بدایونی'' میں ایک جگہ آپ نے لکھا ہے: ''نقطے لگا کر بیاض چھوڑ دیا گیا ہے'' (ص:۱۳) ''بیاض'' مذکر نہیں مونث ہے۔

امید ہے کہ میری یہ ''حرف گیری'' ناگوارِ خاطر نہ ہوگی۔(مؤرخہ ۷ ر دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی

(سابق پروفیسر وصدر شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی مظفر پور بہار)

مولانا اُسید الحق قادری اردو اور عربی زبان وادب کے عالم و عارف کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں یگانہ و ممتاز ہیں یعنی وہ مجمع البحرین ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ اُردو کے بڑے عالم ہیں یا عربی کے۔ موضوع بڑا خشک اور بے رس تھا، مگر انہوں نے شگفتگیٔ زبان و بیان سے آراستہ کرکے اس کو بے حد آسان اور حلاوت بخش بنا دیا ہے۔

محاورہ مخصوص تقاضوں، رسموں اور موقعوں کے مطابق لفظوں کو بدلے ہوئے سیاق وسباق میں بدلے ہوئے معنوں کے ساتھ استعمال کرنے کا نام ہے۔ ہر زبان میں محاورات کی ایک دنیا ہوتی ہے جو موقع محل سے بات چیت یا عبارت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ مولانا موصوف نے عربی زبان کو اہلِ زبان کی طرح اس کی روح میں ڈوب کر اپنی دسترس میں کر لیا ہے۔ عربی محاورات کو اردو والوں سے روشناس کرانا اس قدرت تامہ کا مظہر ہے۔ انہوں نے عربی ادب کے بحرِ ناپیدا کنار میں غواصی کر کے جو دُر ہائے آبدار نکالے ہیں اُن کی آب و تاب میں بہر دور کمی آنے کا اندیشہ نہیں۔ عربی مدارس اور عصری دانش گاہوں کے طلبہ و طالبات اس گراں مایہ سرمایۂ محاورات سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ (مؤرخہ ۲۴؍دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆

مولانا اُسید الحق قادری اسلامیات کے ممتاز اسکالر، اُردو زبان و ادب کے ادا شناس اور جدید تنقید و تحقیق کے مزاج اور سمت و رفتار سے واقف قلم کار کی حیثیت سے ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ اُن کی تحریروں میں گہرائی، تازگی اور تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ اِس لئے عام قارئین کے علاوہ خاصانِ علم و ادب بھی اُن کے ہر ہر جملے کو چبا چبا کر پڑھتے ہیں اور محظوظ و مستفید ہوتے ہیں۔

''خیر آبادیات'' اُن کی تازہ پیشکش ہے جو ''ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیان اپنا'' کے مصداق

ہے۔ انھوں نے علامہ فضل حق خیرآبادی (علیہ الرحمہ) سے متعلق بکھرے ہوئے تمام موافق و مخالف مواد کو یکجا کر کے جس تحقیقی ذمہ داری کے ساتھ اپنا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے وہ بے حد اہم اور چشم کشاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے علامہ کے بارے میں معاندین ومخالفین کے ذریعے پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا ریت محل ڈھے جائے گا اور حقیقت و واقعیت اپنا پرچم لہرائے گی۔ اس کتاب مستطاب میں مولانا موصوف کی ژرف نگاہی، زور قلم اور قوت استدلال کو دیکھ کر مجھے اُن کی ذات میں اُردو تحقیق کے معلّمِ اول حافظ محمود خاں شیرانی کی نمود نظر آتی ہے۔ خدائے پاک میرے اِس حسن ظن کو قائم ودائم رکھے، آمین۔ (مؤرخہ ۲۴ر دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر سلمہ سیہول

(اسسٹنٹ پروفیسر، بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان)

خیال تھا کہ علامہ محمد فضل حق خیرآبادی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال مکمل ہونے پر ''خیرآبادیات'' از مولانا اسید الحق قادری بدایونی مدرسۂ بدایوں کی اپنے واجب سے عہدہ برآ ہونے کی محض ایک عقیدت مندانہ کوشش ہوگی۔ مگر مطالعۂ کتاب جس قدر بڑھتا گیا، احساسات و خیالات بدلتے گئے اور فضل حق پسندوں سے میرا شکوہ وگلہ کم اور غصہ ٹھنڈا پڑتا چلا گیا۔

''خیرآبادیات''، علمی دیانت و امانت اور جدید اصولِ تحقیق پر مبنی پُرخلوص، مفید، معلومات افزا کاوش ہے۔ اِس کتاب سے علامہ فضل حق کے علم وفضل کے باب کی بدایونی فصل مکمل ہوئی اور علمی حقائق کے گرد مخالفین فضل حق کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا ازالہ اور وقت کی گرد صاف ہوئی، جو علمی ذخائر کے امین ومحافظ مدرسۂ بدایوں ہی سے ممکن تھا۔

(تقریظ خیرآبادیات: از مولانا اسید الحق قادری، ص ۱۷، ناشر تاج الفحول اکیڈمی بدایوں ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## مولانا محمد رضی الاسلام ندوی

(ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ)

کئی ماہ قبل آں جناب کی کتاب ''قرآن کریم کی سائنسی تفسیر'' موصول ہوئی تھی اور مَیں نے وصول کا خط بھی لکھ دیا تھا۔ یہ کتاب موجودہ دور کے بہت اہم موضوع سے بحث کرتی ہے۔ آپ نے موضوع کا بھرپور تعارف کرایا ہے اور بہت اچھی اور متوازن بحث کی ہے۔

(مؤرخہ ۱۴؍ اگست ۲۰۰۸ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ بریلوی

(بریلی)

مندرجہ ذیل کتب کے دو سیٹ موصول ہوئے:

۱۔ مفتی لطف بدایونی شخصیت اور شاعری

۲۔ عظمت غوث اعظم

۳۔ نگارشات محبؔ احمد۔

آپ کے حسب الارشاد ایک سیٹ ڈاکٹر شمس بدایونی کو دے دیا جائے گا۔

مَیں ابتدا ہی میں عرض کر دوں کہ آپ نے لطفؔ بدایونی کا کلام شایع کر کے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اب اس شہرت یافتہ نعت گو کا دیوان بھی علمی و ادبی حلقوں میں باریاب ہو جائے گا۔ (مؤرخہ ۱۵؍ ستمبر ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر شکیل اعظمی

(کریم الدین پور، گھوسی، ضلع مئو)

جناب مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری صاحب کا قسط وار مضمون ''تقریروں میں موضوع روایات - ایک لمحۂ فکریہ'' شائع ہوا ہے۔ مضمون انتہائی اہم، وقیع اور چونکا دینے والا ہے۔ موصوف نے جن روایات کو بہ طور حدیث موضوع قرار دیا ہے، وہ یقیناً اہل علم و دانش بالخصوص علما، خطبا اور شعرا کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ مولانا اسید الحق صاحب جامع ازہر کے ممتاز فاضل ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مزاج رکھتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر بے حد شستہ و شگفتہ ہوتا ہے۔ اپنی تحریروں کو پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہونے دیتے۔ تنقیدی اسلوب بھی تلخی و جارحیت سے پاک، خوشگوار سنجیدہ اور متوازن ہوتا ہے، کہیں کہیں طنز و مزاح کی کیفیت ہوتی ہے، لیکن انتہائی لطیف اور نازک، مولانا نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو محسوس کیا اور علمی و فنی حیثیت سے موضوع احادیث پر کلام کیا۔ بیان حدیث میں بے احتیاطی و بے راہ روی اور تساہل پسندی کے سد باب کی کوشش کی اور ذہن و فکر کے جمود و تعطل کو ختم کرنے کی ترغیب دی۔ امید کہ مقررین و واعظین احتیاط سے کام لیں گے اور بلا تحقیق روایتوں کے بیان کرنے سے گریز کریں گے۔

مولانا کے ذریعے موضوع قرار دی جانے والی احادیث پر اگر کوئی صاحب کلام کرتے ہیں اور نقد و جرح سے کام لے کر ان کی اسنادی حیثیت کو صحیح ثابت کرتے ہیں تو یہ بڑا علمی و تحقیقی کارنامہ ہوگا، جس کی دنیائے اہل علم و فن میں پذیرائی ہوگی اور جس کو تسلیم کرنے سے کسی کو بھی انکار نہ ہوگا۔ (ماہنامہ جام نور دہلی، شمارہ نومبر ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## پروفیسر شباہت حسین

(مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ)

مولانا آزاد لائبریری کے لیے تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں کی درج ذیل گیارہ مطبوعات موصول ہوئیں، شکریہ۔

پچاس سالہ جشن کو آپ نے ''جشن اشاعت'' قرار دے کر اہل علم طبقے پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ خدا کرے جشن منانے کا یہ انداز اور جذبہ فزوں تر رہے اور اہل علم کو اس توسط سے بیش بہا تحریریں پڑھنے کے لیے ملتی رہیں، آمین۔ (مؤرخہ ۱۲/اپریل ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

عزیزم تنویر قادری سلمہ کی معرفت آپ کی تازہ ترین تصنیف ''خیر آبادیات'' کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری کے لیے موصول ہوا۔ اس کرم فرمائی کے لیے شکریہ! ہماری لائبریری کے اندراج رجسٹر کے مطابق اس کا نمبر 156121 ہے۔

''خیر آبادیات'' ہماری لائبریری کے لیے ایک گراں قدر عطیہ ہے۔ آپ نے علامہ فضل حق خیر آبادی پر جامع اور بھرپور کتاب تصنیف کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تحقیق میں کچھ بھی حرف آخر نہیں ہوتا لیکن آپ کی مذکورہ بالا کتاب دیکھ کر اس قول کی صداقت پر شبہ ہونے لگا۔ اس شاندار کتاب کی تصنیف پر ہماری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ (مؤرخہ ۲۹/مارچ ۲۰۱۲ء)

☆☆☆

☆

## مولانا عبدالمبین نعمانی

(المجمع الاسلامی، ملت نگر مبارکپور، اعظم گڑھ)

عزیزی مولانا صادق رضا کی معرفت آپ کا تحفۂ بیش بہا ''احقاق حق'' ہم دست ہوا، یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ کتاب آپ نے بہت اچھی چھاپی ہے، تحقیق کا بھی حق ادا کردیا ہے۔ مولیٰ عزوجل آپ کو ایسے بہت سارے کاموں کی توفیق ارزاں فرمائے، **آمین بجاہ سید المرسلین علیہ و آلہ و صحبہ وبارک وسلم.**

تعارف مصنف کے تحت **المعتقد المنتقد** کے ذکر میں المجمع الاسلامی ورضا اکیڈمی کے نسخے کا ذکر بھی ہوجاتا تو بہتر تھا۔ شرف صاحب کا مضمون پرانا ہے اس لیے اس کے حاشیے میں یہ بات آنی بہتر تھی۔ ''چراغ انس'' کی باوقعت اشاعت کی بھی ضرورت ہے جس میں اعلام کے تراجم بھی ہوں اور ایک مفید مقدمہ، آپ خود توجہ دیں یا کسی کو اس کام پر لگا دیں، آپ کی گوناگوں خدمات دینی سے جماعت اہل سنت کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

(مؤرخہ ۲رصفرالمظفر ۱۴۲۸ھ)

☆

سیرت خیرالبشر، الدررالسنیہ مترجم، احوال ومقامات اور تحقیق وتفہیم پر مشتمل پیکٹ موصول ہوا، مسلسل عنایات کا شکریہ، پچاس مؤقر کتابوں کی اشاعت مبارک ہو اور آں جناب کا یہ محمود کارنامہ دوسروں کے لیے نمونہ ثابت ہو۔ مردان کار ایسے ہی کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں **اللھم زد فزد.** ہندی، گجراتی اور انگریزی میں بھی بعض کتب کی اشاعت خوب ہے اور غیر اُردو داں طبقے کے لیے مفید تر۔ بس اب ''سیف الجبار'' کا انتظار ہے، امید کہ بڑی آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آئے گی۔ قصیدۂ ''چراغ انس'' بھی شایانِ شان طریقے سے آتا تو کیا اچھا ہوتا۔

(مؤرخہ ۹رفروری ۲۰۱۰ء)

☆

عرصے سے خط لکھنے کے لیے سوچ رہا تھا، آج بیٹھ ہی گیا۔ سب سے پہلے تو آپ کو مبارکباد کہ آپ نے تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے پچاس کتب اکابر بدایوں کی اشاعت بڑے اہتمام سے کی اور ایک بڑا کارنامہ انجام دیا، ورنہ عرصۂ دراز سے اکابر و مشائخ بدایوں کی کتابیں گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں۔ اکثر کتابیں آپ نے ناچیز کے نام ارسال کیں، اس کا بہت بہت شکریہ۔

کتابوں کا معیار بھی بہت خوب ہے، کاغذ، کمپوزنگ سب قابل قدر اور لائق تحسین ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اشاعتی، تحقیقی اور تصنیفی کارناموں کی توفیق بخشے آمین۔

یقین جانیے آپ کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ جو کام کر رہے ہیں اور جس انداز سے کر رہے ہیں وہ اہل علم کو متوجہ کرنے والا ہے۔ امید کہ آپ اپنی مطبوعات ملک کی مشہور لائبریریوں اور یونیورسٹیوں میں بھی بھیج رہے ہوں گے۔ یہ بات بھی بڑی قابل توجہ ہے، ماضی میں جو غفلت ہوئی اس کا بڑا نقصان ہوا ہے۔

چند ماہ پیشتر جام نور میں آپ کا اداریہ ربیع الاول شریف کے تعلق سے پڑھا، بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے عام قلم کاروں کی طرح صرف مشورے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود آگے بڑھ کر پہلے عمل کیا پھر عمل کی دعوت دی اور فکروں کو جھنجھوڑا، میں نے تو آپ کا مضمون اشک بار آنکھوں سے پڑھا اور خوب سوچتا رہا کہ اس ماہ مبارک کا پیغام واقعی ہم لوگوں نے بھلا دیا ہے اور صرف جشنوں، جلسوں اور جلوسوں میں چھپا کر رکھ لیا ہے۔ جلسوں سے تو پیغام دیا جا سکتا ہے مگر روایتی جلسے نہ ہوں تب۔ امید کہ آنے والے ربیع الاول شریف سے قبل آپ کی تجاویز کو خوب مشتہر کیا جائے گا۔ اس کی کوئی سبیل ضرور نکالیں۔ اپنے اداریے کو مختصر کر کے علیحدہ سے شایع کر دیں تو بہت اچھا ہو، تجاویز کو نمایاں کیا جائے اور آخر میں لکھ دیا جائے کہ الحمدللہ بدایوں میں ان پر عمل ہو رہا ہے، اس سلسلے میں میرے لائق جو خدمت ہوگی میں حاضر رہوں گا۔

(مؤرخہ ۲۸؍جون ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

**ڈاکٹر سید سراج الدین اجملی**

(شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

لائق اخلاف اپنے اسلاف کے کارناموں پر صرف فخر نہیں کرتے بلکہ انہیں روشناس خلق کرانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں، قابل مبارک باد ہیں عزیز گرامی قدر اسید میاں صاحب کہ انہوں نے اس نیک کام کا بیڑا اٹھایا اور علوم عقلی و نقلی، ادب و شاعری اور مسائل فقہی سے متعلق اپنے خانوادے کے بزرگوں کی تحریریں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

(مقدمہ خمیازۂ حیات: عبدالہادی قادری بدایونی، ص ۸، تاج الفحول اکیڈمی بدایوں ۲۰۰۹ء)

☆☆☆

☆

**ڈاکٹر عاصم اعظمی**

(مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، ضلع مئو)

کل کتابوں کا پیکٹ موصول ہوا۔ ''عربی محاورات'' اور ''خیرآبادیات'' کی زیارت سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ آپ کی کاوش فکر اور تحقیقی رویہ لائق صد آفریں و تحسین ہے، خداوند تعالیٰ قبول فرمائے، مزید قرطاس و قلم سے آپ کے ربط کو مزید تقویت عطا فرمائے۔ آمین۔

(مؤرخہ ۵؍دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## مولانا فروغ احمد اعظمی

(دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی بستی)

کتاب ''احقاق حق'' کی وصول یابی پر ایک جوابی مکتوب بھیج چکا ہوں اور پھر دوبارہ اس لیے خط لکھ رہا ہوں کہ آپ کی نئی کتاب ''علوم الحدیث'' کو دارالعلوم علیمیہ کی مجلس تعلیم نے درجۂ سابعہ کی دوسری ششماہی میں برائے مطالعہ داخل نصاب کر لیا ہے۔

لہٰذا فی الحال کم از کم ۱۵؍نسخوں کی ضرورت ہے۔عزیزی مظفر برکاتی مارہروی کو بھیج رہا ہوں، دستیاب کروادیں۔(مؤرخہ ۱۴؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ/۲؍اپریل ۲۰۰۷ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی الازہری

(اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف فیصل آباد، پاکستان)

خانوادۂ بدایوں شریف کے چشم و چراغ ہمارے فاضل دوست صاحبزادہ اُسید الحق قادری بدایونی نے برصغیر کے ایک عظیم محسن علامہ محمد فضلِ حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی ادبی اور تاریخی عظمت کو خالص علمی اور تحقیقی اسلوب میں اجاگر کرتے ہوئے خیرآبادی خانوادۂ علم و فضل کے خوشہ چینوں اور آزاد برصغیر کے باسیوں کی طرف سے اجتماعی قرض چکانے کی ایک قابلِ قدر خدمت سرانجام دی ہے، فاضل موصوف نے علامہ خیرآبادی کے ساتھ گہری عقیدت کے باوجود کہیں بھی اپنے اسلوب اور لہجے کو علم و تحقیق کے دائرے سے نکلنے نہیں دیا۔ مجھے امید ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے رتجگوں کا یہ ثمر پاک و ہند کے محققین کے سامنے خیرآبادیات پر تحقیق کی مزید راہیں کھولے گا۔

(تقریظ خیرآبادیات: از مولانا اسید الحق قادری، ص ۱۸، ناشر تاج الفحول اکیڈمی بدایوں ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

☆

## مولانا شہاب الدین رضوی

(آل انڈیا جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی)

کل آپ کی روانہ کردہ کتابیں موصول ہوئیں، احقر آپ کا ممنون ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری کے ریمارکس پر آپ نے جو تحقیقی پہلو اختیار کیا وہ بہت ضروری تھا۔ ۱۸۵۷ء میں علمائے اہل سنت نے اہم کردار ادا کیا ہے، بالکل اسی طرح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے جد امجد جناب مولانا مفتی رضا علی خاں بریلوی کے ساتھ بھی ہوا۔ میں نے ایک طویل مقالہ ۲۰۰۷ء میں ''مولانا رضا علی خاں بریلوی اور جنگ آزادی'' کے نام سے لکھا تھا، دہلی میں طباعت کا کام ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر ایوب قادری کی ایک کتاب کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ ''ارباب فضل و کمال بریلی، کراچی ۱۹۷۰ء'' احقر کو درکار ہے اگر ممکن ہو تو فوٹو اسٹیٹ بھجوا دیں، ممنون ہوں گا۔ آپ نے ''مولانا فیض احمد بدایونی'' ص:۷ سطر ۱۷، ۱۶ پہ جو تحریر کیا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ احقر کی کتاب ''حیات تاج الفحول'' پر آپ کے تأثر کا منتظر ہوں۔ (مؤرخہ ۱۹ر فروری ۲۰۰۸ء)

☆

مولانا اکرم قادری صاحب کے ذریعے کتابیں موصول ہوئیں اور آج آپ کا مضمون آیا، ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ ماشاءاللہ بہت اچھا اور معلوماتی ہے۔ کچھ گوشے ایسے ہیں جن پر تفصیل سے لکھا جانا چاہیے، تاہم آپ نے ''مطبع اہل سنت بریلی'' کا تعارفی خاکہ، خدمات کا اجمالی تذکرہ کر کے تاریخی حیثیت دی ہے۔ (مؤرخہ ۴ر مارچ ۲۰۰۹ء)

☆☆☆

☆

## مولانا سید قمر شاہ جہانپوری

(صدر مجلس علمائے اسلام، کانپور)

آپ کی ارسال کردہ کتابیں نظر افروز ہو کر دل و دماغ کو روشن کر رہی ہیں۔ اس عنایت کا کس طور پر شکریہ ادا کیا جائے۔

حضرت خطیب اعظم علامہ عبدالماجد بدایونی علیہ الرحمہ اور حضرت گرامی مرتبت مولانا شاہ عبدالہادی صاحب ہادیؔ علیہ الرحمۃ کے کوائف اور اُن کی خدمات نیز شعر و ادب کے سرمائے نے معلومات میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ متاثر بھی کیا۔ دیگر کتب مطالعہ میں ہیں۔

مذکورہ بالا عنایات کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ آپ اس وقت جو علمی تحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سب اہم خدمات کے لیے وقت کو آپ جیسی شخصیت کا انتظار تھا۔ ماشاء اللہ، بارک اللہ، میری جانب سے بہت بہت مبارک باد۔ رب کریم آپ کی شخصیت میں مزید چاند روشن فرمائے۔ آمین۔ (مؤرخہ ۲۱/اپریل ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی

(شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ادھر ایک سال کے دوران آپ کی کئی کتابیں موصول ہوئیں۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ خواہش تھی کہ تفصیل سے اظہار خیال کروں، یہی سوچتا رہا اور رسید میں اس قدر تاخیر ہوئی، معذرت قبول فرمائیں۔ جام نور میں آپ کے مضامین نظر نواز ہوتے رہتے ہیں۔ تازہ مضمون ''تقریروں میں موضوع روایات'' بھی حسبِ معمول بہت خوب ہے۔ (مؤرخہ ۱۷/ستمبر ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## مولانا تطہیر احمد رضوی

(دھونرہ ضلع، بریلی)

والا نامہ مع چند مطبوعات تاج الفحول اکیڈمی موصول ہوا۔ یاد آوری کرم فرمائی ہے،نوازش کے لیے مشکور ہوں۔ مَیں جناب کے نسبی وکسبی فضائل سے کافی حد تک واقف ہوں۔ کئی لوگوں سے جناب کے بارے میں اچھے تأثرات سن چکا ہوں۔ کم عمری میں یہ علم وفضل، خدمات وخلوص اس سب کو تائید غیبی وتوفیق الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے۔ ''بالائے سرش ز ہوش مندی - می تافت ستارۂ بلندی''

ماہنامہ جام نور کی طرف سے بھی مَیں نا آشنا اور غافل نہیں ہوں۔ آپ کے کئی مقالے میری نظر سے گذرے ہیں۔ خدائے تعالیٰ سلامت رکھے۔ مایوسیوں کے اندھیرے میں آپ امید کی کرن ہیں۔ اپنے اکابر ومشائخ اور آبائے کرام کی تصنیفات کو منظر عام پر لانے کا اقدام آپ کے لیے قابل مبارکباد ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ برصغیر میں جو اسلام وسنیت کی بہار ہے اس میں بڑا حصہ آپ کے بزرگوں کا ہے اور جن کے دل میں خوفِ خدا ہے جزوی وفروعی اختلافات ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مرسلہ مطبوعات پر ایک سرسری نظر ڈال لی ہے، ابھی تفصیل سے نہیں دیکھ سکا ہوں لیکن دیکھنے کا پکا ارادہ ہے اور توفیق رب کریم کی طرف سے ہے۔ یہ کتابیں یقیناً میرے لیے مفید ثابت ہوں گی اور میرے کام میں معاون۔

میرا کام اور کتابیں آپ کو پسند آئیں، یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے، بلکہ میری کامیابی اور مقبولیت کی سند۔ میں تو ایک عوامی مولوی ہوں پڑھے لکھے لوگ بھی قدر کی نظر سے دیکھنے لگیں تو امید قوی ہے کہ قیامت کے دن سرخ روئی نصیب میں آئے اور اپنے رب کی رضا حاصل کرنا اور اس کے نبی پاک کی شفاعت کا طلبگار رہنا ہر مسلمان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

**وله الامر والحمد من قبل ومن بعد فی الاولی والآخرة**

(مؤرخہ ۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ/ ۷ مارچ ۲۰۰۹ء)

☆☆☆

☆

## مولانا اختر حسین فیضی مصباحی

(امام احمد رضا لائبریری، مبارک پور، اعظم گڑھ)

جشن زریں کے موقع سے تاج الفحول اکیڈمی کے ذریعے چھپی ہوئی کتابوں کی ایک طویل فہرست دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، جس میں خانقاہ قادریہ بدایوں کے بزرگوں کی تصنیفات اور آپ کے رشحات شامل ہیں، اس کے لیے آپ ناچیز کی طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

(مؤرخہ ۲۵؍جنوری ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## مولانا اُمید علی صدیقی

(علیمی لائبریری، جمد اشاہی، بستی)

آپ کی تازہ کتابیں ''تحقیق و تفہیم'' اور ''خامہ تلاشی'' دیدہ زیب اور عمدہ طباعت و کتابت سے آراستہ ہو کر علیمی لائبریری کو موصول ہوئیں ہیں، اس عطیے پر ادارہ آپ کا بے حد ممنون ہے اور امید کرتا ہے کہ مستقبل میں بھی آپ اپنی تازہ مطبوعات ادارے کو ارسال فرماتے رہیں گے۔

آپ کی تحقیق و تنقید یقیناً لائق ستائش ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مزید آپ کے امثال پیدا فرمائے اور آپ کے قلم کو مزید توانائی عطا فرما کر نظر بد سے محفوظ رکھے (آمین)۔ (۲؍فروری ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## مولانا ریحان رضا انجم رحمانی مصباحی

(دارالعلوم قادریہ رحمانیہ،بسفی مدھوبنی، بہار)

جشن سجادگی کو''جشن اشاعت'' کےطور منانا صرف لائق مبارکباد ہی نہیں بلکہ لائق تقلید ہے۔مَیں تو دعا کرتا ہوں کہ ربّ قدیر ہر خانقاہ اہل سنت کو آپ جیسا صاحبزادہ عطا فرمادے تا کہ وہ **الولد سر لابیہ** کےطور پر آباواجداد کی علمی،تبلیغی،تصنیفی وراثت کی حفاظت فرمائے۔آمین بجاہ سیدالمرسلین ﷺ۔(۲۲/فروری ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

☆

## محمد اقبال عثمان میمن

(مدیر اعلیٰ ماہنامہ سیارگان ممبئی)

''احقاق حق'' کتاب بنام تقویۃ الایمان کے رد میں لکھی گئی، جس کو اہل سنت والجماعت کے بے باک اور نڈر عالم دین حضرت علامہ فضل رسول قادری بدایونی علیہ الرحمہ نے مفصل و مدلل و براہین کے ساتھ احقاق حق کو فارسی زبان میں تقریباً ۱۲۶۵ھ میں تصنیف فرما کر اعوان نجدیت میں ایک زلزلہ برپا کردیا تھا۔احقاق حق کا اردو ترجمہ جنوری ۲۰۰۷ء میں محقق عصر فاضل جامعۃ الازہر مصر حضرت علامہ مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری مدظلہ العالی نے فرما کر اہل سنت والجماعت پر بڑا احسان فرمایا ہے۔

قابل صد مبارک باد ہیں تاج الفحول اکیڈمی ضلع بدایوں یوپی کے اراکین جنہوں نے احقاق حق کا اردو ترجمہ شائع فرما کرامت مسلمہ پہ بڑا احسان کیا ہے۔

(ماہنامہ سیارگان ممبئی، مئی ۲۰۰۷ء،ص ۵۶)

## مطبوعات تاج الفحول اکیڈمی بدایوں

| | | |
|---|---|---|
| ۱ | **احقاق حق** | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۲ | **عقیدۂ شفاعت** (اردو، ہندی، گجراتی) | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۳ | **اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ** | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۴ | **اکمال فی بحث شد الرحال** | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۵ | **فصل الخطاب** | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۶ | **حرز معظم** | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۷ | **مولود منظوم مع انتخاب نعت ومناقب** | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۸ | **شوارق صمدیہ ترجمہ بوارق محمدیہ** | سیف اللہ المسلول شاہ فضل رسول بدایونی |
| ۹ | **شمس الایمان** | مولانا محی الدین قادری بدایونی |
| ۱۰ | **تحقیق التراویح** | نور العارفین سید شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہروی |
| ۱۱ | **الکلام السدید** | تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی |
| ۱۲ | **رد روافض** | تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی |
| ۱۳ | **سنت مصافحہ** | تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی |
| ۱۴ | **احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام** | تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی |
| ۱۵ | **تبعید الشیاطین** | حافظ بخاری مولانا شاہ عبدالصمد سہسوانی |
| ۱۶ | **مردے سنتے ہیں؟** | مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی |
| ۱۷ | **مضامین شہید** | مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی |
| ۱۸ | **ملت اسلامیہ کا ماضی حال مستقبل** | مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی |
| ۱۹ | **عرس کی شرعی حیثیت** | مولانا عبدالماجد قادری بدایونی |
| ۲۰ | **فلاح دارین** (اردو، ہندی) | مولانا عبدالماجد قادری بدایونی |
| ۲۱ | **نگارشات محب احمد** | علامہ محبّ احمد قادری بدایونی |
| ۲۲ | **عظمت غوث اعظم** | علامہ محبّ احمد قادری بدایونی |
| ۲۳ | **شارحة الصدور** | مفتی حبیب الرحمٰن قادری بدایونی |
| ۲۴ | **الدرر السنية** ترجمہ از : | مفتی حبیب الرحمٰن قادری بدایونی |
| ۲۵ | **احکام قبور** | مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی |

| | | |
|---|---|---|
| ۲۶ | **ریاض القرأت** | مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی |
| ۲۷ | **خطبات صدارت** | عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی |
| ۲۸ | **مثنوی غوثیه** | عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی |
| ۲۹ | **عقائد اهل سنت** (اردو، ہندی) | مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی |
| ۳۰ | **دعوت عمل** (اردو، انگلش، ہندی، مراٹھی، گجراتی) | مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی |
| ۳۱ | **فلسفه عبادات اسلامی** | مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی |
| ۳۲ | **مختصر سیرت خیر البشر** | مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی |
| ۳۳ | **احوال ومقامات** | مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی |
| ۳۴ | **خمیازۂ حیات** (مجموعۂ کلام) | مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی |
| ۳۵ | **باقیات هادی** | مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی |
| ۳۶ | **مدینے میں** (مجموعۂ کلام) | حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری بدایونی |
| ۳۷ | **احادیث قدسیه** (اردو، انگلش، گجراتی) | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۳۸ | **تذکرۂ ماجد** | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۳۹ | **خامه تلاشی** (تنقیدی مضامین) | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۰ | **تحقیق وتفهیم** (تحقیقی مضامین) | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۱ | **عربی محاورات** مع ترجمہ وتعبیرات | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۲ | **اسلام: ایک تعارف** (ہندی، انگلش، مراٹھی) | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۳ | خیرآبادی سلسلہ علم وفضل کے احوال وآثار **خیرآبادیات** | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۴ | **قرآن کریم کی سائنسی تفسیر** | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۵ | **مفتی لطف بدایونی**: شخصیت اور شاعری | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۶ | **حدیث افتراق امت** تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں | مولانا اسیدالحق قادری بدایونی |
| ۴۷ | **طوالع الانوار** (تذکرۂ فضل رسول) | مولانا انوارالحق عثمانی بدایونی |
| ۴۸ | **اسلام میں محبت الٰهی کا تصور** | مولانا دلشاد احمد قادری |
| ۴۹ | **تذکرۂ خانوادۂ قادریه** | مولانا عبدالعلیم قادری مجیدی |
| ۵۰ | **اظهار واعتراف** | محمد تنویر خان قادری بدایونی |
| ۵۱ | **خواجه غلام نظام الدین قادری** | محمد تنویر خان قادری بدایونی |